با کا اِنتظار
سیّد محمّد اشرف

بادِ صبا کا اِنتظار

(کہانیوں کی کتاب)

سیّد محمد اشرف

نام کتاب	:	بادِ صبا کا انتظار (کہانیوں کی کتاب)
مصنف	:	سید محمد اشرف
موجودہ پتہ	:	B-1 حیدر آباد اسٹیٹ، نے پین سی روڈ، ممبئی 36
مستقل پتہ	:	بڑی سرکار، خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ شریف، ایٹہ، اترپردیش
اشاعت	:	دسمبر ۲۰۰۰ سن رائج
تعداد	:	600
قیمت	:	150/-
سرورق	:	بشکریہ فلپس اینڈ کمپنی، ریگل، ممبئی (تاجر و ماہر نوادرات)
کمپوزنگ	:	جاوید یوسف غزالی ٹائپ سیٹرس اینڈ پرنٹرس Tel: 266 3495 / 262 1240
ناشر	:	اطہر عزیز، ایڈ شاٹ پبلی کیشنز، ممبئی Tel: 204 2899 / 282 5883
طابع	:	کیلکو پریس، ایم۔ای۔ سارنگ مارگ، ممبئی ۳ Tel: 371 2313
تقسیم کار	:	۱) تخلیق کار پبلشرز، 104/B یاور منزل، I بلاک، لکشمی نگر، دہلی 110092 ۲) قلم پبلی کیشنز، ۱۷/۷ اایل آئی جی کالونی، کرلا (مغربی)، ممبئی ۷۰
ملنے کے پتے	:	شب خون کتاب گھر، 313، رانی منڈی، الہ آباد مکتبہ جامعہ، علی گڑھ، دلی، ممبئی ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت لال کنواں، دہلی بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ

T.P. 022 2000
BAADEY SABAA KAA INTIZAAR (SHORT STORIES) RS. 150/-
SYED MUHAMMAD ASHRAF
AD SHOT PUBLICATIONS,
2ND NANABHAI LANE, FOUNTAIN, MUMBAI 400 001.

بسم الله الرحمن الرحيم

ہر چہ بینی در جہاں از آیتے
ہست بہرِ معنیٔ و حکمتے
(مولانا جلال الدین رومی)

دنیا میں تو جو بھی نشانی دیکھے گا
وہ کسی معنی اور حکمت کے لئے ہے

اِنتساب

اپنے بچوں

نَبِیل،

شِفا،

نَاظِم،

کے نام

اِس دُعا کے ساتھ

کہ

وہ بڑے ہو کر اِن کہانیوں کو اسی زبان میں پڑھ سکیں

کہ

بادِ صبا کے اِنتظار کی مدّت کچھ تو کم ہو

سیّد محمّد اشرف

ترتیب

ساتھی

اچانک آنکھ کھلی۔ کوئی کھٹکا ہوا تھا۔ ٹیبل لیمپ جلایا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے سو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور دھیرے دھیرے خراٹوں کی آواز کمرے کے سناٹے میں گونج رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اسے اس وقت بالکل ایسا نہیں لگا کہ آج رات بحث کے دوران اس نے چھٹیوں میں بچوں کو دادی کے پاس لے جانے سے منع کیا ہو۔ اس کا اصرار تھا کہ اس بار ہم لوگ چھٹیوں میں ساؤتھ چلیں گے۔ انور نے سمجھایا کہ ہم پہلے وطن چلیں وہاں اماں سے مل آئیں پھر بنگلور چلے چلیں گے۔ جواب میں اس نے سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ سسرال جاکر گھومنے پھرنے کے لئے گھر سے نکلو تو عجیب طرح کا احساس ہوتا ہے۔ وہ وضاحت نہیں کر سکی تھی لیکن انور سمجھ گیا تھا۔ لیکن سمجھنے کے باوجود وہ رنجیدہ ہوا تھا۔ سوتے وقت اس نے اماں کو یاد کیا۔ گھر

کے دالانوں کو یاد کیا۔ آبائی قصبے کے کھیتوں اور باغوں کو یاد کیا۔ اب نیند بہت اُچٹ اُچٹ کر آتی ہے۔ برسوں سے یہ معمول بن گیا ہے۔ دن میں کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔

انور آفس سے آنے کے بعد بچوں سے کچھ دیر کھیلا تھا۔ ابھی ذرا دیر بھی نہیں کھیل پایا تھا۔ "چلو چلو کھیل ختم۔ دن بھر تم ہی لوگوں میں بیت جاتا ہے۔ کھانا کھا کر سو جاؤ۔ تمہارے پاپا کو ابھی بہت کام ہیں۔"

بچوں کے پاس کم وقت گزرپاتا ہے۔ صبح وہ لوگ اسکول کی تیاریوں میں لگے رہتے ہیں اور شام کو تھکے ماندے آؤ تو دل چاہتا ہے کہ دن بھر کے بچھڑے ہوئے بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزارا جائے کہ بیوی کا روٹین شروع ہو جاتا ہے۔ انور بحث مباحثے سے بہت گھبراتا ہے۔ عام طور پر یہ ہار جاتا ہے۔ انور نے نیم روشن کمرے میں جاکر بچوں کو ایک نظر دیکھنا چاہا۔ بچے اس کی آہٹ پر آنکھیں کھول کر مسکرانے لگے۔ تبھی بیوی نے بچوں کو اور اسے تیز نظروں سے دیکھا۔ بچے سہم کر آنکھ بند کر کے سونے کی اداکاری کرنے لگے۔ وہ بھی دل گرفتہ کمرے سے نکل کر اسٹڈی روم میں آگیا۔ عزیز احمد کا ناول "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" سامنے رکھا تھا۔ اس نے ناول اٹھایا اور کھو گیا۔ لگا جیسے دن بھر کی کلفت آہستہ آہستہ صابن کے جھاگ کی طرح پانی بن کر بہہ رہی ہے اور ذہن آسودہ ہو رہا ہے۔ بیوی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

"آپ تو پھر ان کتابوں میں کھو گئے۔ چلیے 'کلونلپ،انساکشری' آرہی ہے۔"

وہ ناول کے بے حد نازک حصے پر تھا، جب تیمور صحرا کے کنوئیں میں اپنی بیوی کو چھپا کر ساتھیوں کی تلاش میں نکلتا ہے۔ یہ حصہ بہت رک رک کر پڑھتا تھا، پورا لطف لے کر۔

"بہت مزے کی چیز پڑھ رہا ہوں بیگم! ابھی ضد نہ کرو۔"

"ٹی وی والا پروگرام پھر نہیں آئے گا۔ یہ کتاب تو یہیں رہے گی۔" بیوی کی ایسی ہی معقول دلیلوں کے آگے وہ خود کو شدید بے بس محسوس کرتا تھا۔ وہ بیوی کو کیسے سمجھاتا کہ زندگی کے وہ لمحے کبھی واپس نہیں آتے جب سکون کے ساتھ گھر میں پسند کی کوئی کتاب پڑھی جاتی ہے۔ یہ بات اس کی بیوی سمجھ ہی نہیں سکتی۔ وہ اس سے آٹھ برس چھوٹی تھی، کانوینٹ کی پڑھی تھی اور انور نے قصبے کے ہائی اسکول سے پڑھائی شروع کی تھی۔ دونوں کی سوچیں بہت مختلف تھیں۔

وہ پچھلے کئی برس سے اس تلاش میں تھا کہ اپنے گھر میں سکون کے ساتھ اپنی مرضی سے چند گھنٹے اپنے طور پر گزارے۔ کتنی معمولی خواہش تھی جو پوری ہی نہیں ہوتی تھی۔ آفس کی پابندی بھگت کر جب انور گھر میں داخل ہوتا تو پابندیوں کی ایک نئی ترتیب اس کا انتظار کر رہی ہوتی تھی۔ اس کی بیوی کا یہ خیال غالباً بہت واجب تھا کہ زندگی میں نظم وضبط اور پابندیاں بہت ضروری ہوتی ہیں۔

آج بھی نیند بہت اچٹ اچٹ کر آئی تھی۔ خواب میں بھی عجیب عجیب منظر دیکھے۔ دیکھا کہ وہ نیلے آسمان کے نیچے چلا جا رہا ہے اور سفید بگلوں کی قطار اوپر اڑ رہی ہے۔ اچانک اس کے اوپر ایک پنجرہ گرا اور وہ اس میں قید ہو گیا۔ انور کو اچھی طرح یاد تھا کہ یہ خواب دیکھنے کے بعد اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ آنکھ تو کسی اور آواز سے کھلی تھی۔

اس نے آہستگی سے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس نکالی اور سٹکنی کھول کر برآمدے کی ٹھنڈی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ یہ فروری کا مہینہ تھا اور فروری کا مہینہ خنک ہوتا ہے۔ لان کی طرف سے ہوا کا جھونکا آیا۔ اس نے تھوڑا سا منھ کھول کر جلدی جلدی چند سانسیں لیں۔ لان کے اونچے اونچے درختوں میں الجھ کر چاندنی گھاس پر دھوپ چھاؤں جیسے رنگ بنا رہی تھی۔ اس نے ماچس جلا کر سگریٹ سلگانی چاہی۔ ماچس کی تیلی کی پہلی زوردار بھڑک میں اس نے محسوس کیا کہ اس کے پاس ہی سیڑھیوں کے نیچے کوئی کھڑا ہے جس کا لمبا سایہ لان پر جا کر گرا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا لیکن اس نے فوراً خود پر قابو پالیا۔ خود کو اعتماد دینے سے پہلے اس نے سگریٹ کا لمبا سا کش لیا۔

"کون ہے؟" اس نے بھاری لیکن نرم آواز میں پوچھا۔

اپنی آواز کے خفیف ارتعاش کو اس نے محسوس کر لیا تھا۔

وہ سایہ آگے بڑھا۔ ابھی بھی وہ آدھا تاریکی میں تھا۔ ممکن ہے تاریکی والے حصے میں اس کا جو ہاتھ ہے اس میں کوئی ہتھیار ہو۔ انور نے قدرے ملائمت سے کہا۔

"اگر بھوکے ہوں تو میں کھانا وغیرہ لاؤں۔ مگر اس وقت ہمارے گھر میں آپ کیسے آگئے؟"

وہ روشنی میں آگیا۔

انور کو لگا وہ اس کا ہم عمر ہے۔ اس کا لباس جدید تھا، لیکن شکستہ۔ چہرے اور داڑھی کے

بال بڑھے ہوئے تھے۔ وہ کرمچ کے سفید جوتے پہنے ہوئے تھا۔ وہ خاموش رہا۔

انور آہستہ سے کھنکارا اور اس کھنکار کی آواز سے طاقت محسوس کی۔ آہستگی سے ایک طرف ہو کر اس سے بیٹھنے کے لئے کہا۔

وہ جھجک کر انور کے پاس بیٹھ گیا۔

''دراصل میں بھاگ نہیں سکا۔ آپ نے بہت تیزی سے دروازہ کھولا اور باہر آ کر بالکل میرے قریب بیٹھ گئے۔''

''آپ بھاگنا کیوں چاہ رہے تھے؟'' انور کا خوف کم ہوتا جارہا تھا۔ ہتھیار ہاتھ میں نہیں ہے، جیب میں ہوگا۔ تو جب تک یہ جیب میں ہاتھ ڈالے گا میں اس پر حاوی ہو جاؤں گا۔ لیکن اگر اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوا تو؟ اچانک گیٹ پر زنجیر کھڑکنے کی آواز ہوئی اور کوئی سایہ دور تک بھاگتا چلا گیا۔

''یہ آپ کا ساتھی تھا؟''

''جی ہاں! وہ سمجھ رہا ہے کہ آپ نے مجھے پکڑ کر بٹھالیا ہے۔ اس لئے خوف زدہ ہو کر بھاگ گیا ہے۔'' دونوں کچھ دیر چپ رہے۔

''آپ کا لان بہت خوب صورت ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ لان میں باغات جیسے بڑے بڑے درخت ہیں۔ آج کل کے فیشن ایبل لان کی طرح نہیں جہاں کمر سے اونچی کوئی ہریالی نظر ہی نہیں آتی۔''

انور نے قدرے طمانیت سے سگریٹ کا بڑا سا کش لیا اور کہا۔

''یہ ہمارا شہر کا پشتینی مکان ہے اور اس لان کی عمر لگ بھگ پچاس برس ہے۔ میرے پاپا نے اسے بہت چاہ سے لگایا تھا۔ افسوس کہ وہ اس کی بہاریں نہ دیکھ سکے۔''

اسے یاد آیا پاپا بچپن میں مجھے کھرپی دے کر گڑھے کھودنے کا حکم دے کر اندر جا کر اماں سے میری باغبانی میں دلچسپی کا ذکر کرتے تھے۔ میں دروازے سے کان لگا کر سنتا تھا۔ ان کے دھیمے دھیمے سرگوشیوں جیسے الفاظ اور اماں کی دبی دبی ہنسی کی آواز جیسے روح میں اتر جاتے تھے اور میں باہر آ کر تیزی سے پھر گڑھے کھودنے لگتا۔ مالی منع کرتا تو میں اس کی بات ہاں ناں کر کے ٹال دیتا۔

''ان میں کون کون سے درخت ہیں؟'' اجنبی نے دریافت کیا۔

"آم زیادہ ہیں، امرود بھی ہیں۔ چند درخت شیشم کے ہیں اور دو درخت نیم کے اور باقی اشوک۔"

"نیم کے درخت بھی ہیں۔" اسے حیرت ہوئی۔ "آج کل تو نیم کے درخت کا اتنا توڑا ہے کہ نمکولی دیکھنے کو نہیں ملتی۔"

بچپن میں جب سورج دہک رہا ہوتا تھا تو وہ اپنے خالہ زاد بھائیوں کے ساتھ ننھیال میں نیم کی نمکولی بیننے قبرستان جاتا۔ وہاں نانا کی قبر پر فاتحہ پڑھتا۔ قبر کی گھاس صاف کرتا۔ پھر برابر کے کنویں سے دو ڈول پانی لاتا۔ قبر کو تر کرتا اور پھر نمکولی بیننے میں لگ جاتا۔

"جی ہاں! اور میں ان کا بہت خیال رکھتا ہوں۔ پاپا کو بھی یہ درخت اپنے طبی فوائد کے سبب بہت عزیز تھا۔ اماں اب بھی اس کے پتے گھر لے جاتی ہیں۔"

"آپ کی ماں یہاں نہیں رہتیں؟"

انور چپ رہا۔

"آپ کی والدہ کہیں اور رہتی ہیں؟"

"جی! وہ قصبے والی حویلی میں رہتی ہیں۔ دراصل قصبے میں بھی کوئی ذمہ دار شخص مکان آباد رکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے نا اس لئے۔" وہ اس کے آگے کچھ نہیں بول سکا

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" تھوڑی دیر بعد اس نے اجنبی سے سوال کیا۔

"میں آپ کے قصبے سے ذرا آگے سلیم پور میں رہتا ہوں۔"

"ایں۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا آبائی قصبہ کون سا ہے؟"

"جی ہاں۔ آپ کو آدھا شہر جانتا ہے اور ان میں سے آدھے لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ کا آبائی قصبہ کہاں ہے۔ یہاں آپ کا فائنانس کا آفس کس عمارت میں ہے اور یہاں آپ کا ایکسپورٹ آفس کس لوکلیٹی میں ہے۔ آپ یہاں کے مشہور ایکسپورٹر ہیں جناب۔"

انور کے منہ سے ایک گہری سانس نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اب اس کی نظر اجنبی کی پتلون کی جیب کے ابھار پر پڑی۔ پستول صاف محسوس ہو رہا تھا۔ اسے کپکپی سے آ گئی۔

اجنبی نے بغیر کسی تاثر کے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پستول نکال کر اس کی گولیاں نکالیں اور نال کا رخ اپنی طرف کر کے انور کی طرف بڑھایا۔ ہتھیار دکھانے کا یہ باضابطہ طریقہ انور کو لڑکپن سے معلوم تھا۔

وہ دادا اور ان کے برابر کے ساتھیوں کے ساتھ نیل گائے اور ہرن کے شکار کے لئے اوسرے میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ گیہوں کٹ چکے تھے اور میدان صاف تھے۔ اچانک میدان میں دھول اڑی۔ سب سمجھے شاید نیلوں یا ہرنوں کی باگڑ بھاگی چلی آ رہی ہے۔ سب جلدی جلدی ہتھیار نکال کر باغ کے کونوں میں جم گئے۔

جب غبار قریب آیا تو معلوم ہوا کہ پلٹن کمپنی والوں کی جیپ ہے۔

"لاحول ولا قوۃ" دادا بڑبڑائے "اب کم بخت ٹیلسکوپ والے رائفل سے دور دور سے نیلے اور ہرن ماریں گے اور ہم تاپتے رہ جائیں گے۔"

جیپ رکی۔ پلٹن والا بڑا صاحب اترا۔ دادا کو دیکھ کر ہاتھ اٹھا کر مسکرا مسکرا کر وش کیا اور پھر پوچھا، "کیوں میاں صاحب! کچھ پانی کھانا ساتھ لے کر نکلے ہیں یا ہماری طرح ہی پھر رہے ہیں؟"

دادا مسکرائے۔ پھر آم کے درختوں کے درمیان بیٹھ کر دونوں پارٹیوں نے اپنا اپنا کھانا نکالا۔ کھانا کھا کر دادا نے ان کی رائفل دیکھنے کی فرمائش کی۔ بڑے صاحب نے بولٹ کھول کر میگزین سے کارتوس نکالے اور رائفل کی نال اپنی طرف کر کے رائفل دادا کی طرف بڑھائی۔

"آپ کی آنکھ کیسے کھل گئی؟"

"باہر کھٹکا سا ہوا تھا۔"

"وہ میرا پاؤں گملوں سے ٹکرا گیا تھا۔"

"مگر آپ اتنی کم آواز سے کیسے جاگ جاتے ہیں؟"

انور چپ رہا۔

"آپ اتنی آسانی سے کیسے جاگ جاتے ہیں؟" اس نے دوبارہ پوچھا

"دراصل میں بہت گہری نیند نہیں سو پاتا۔ اعصابی تناؤ میں رہتا ہوں۔ نیند اُچٹ اُچٹ کر آتی ہے۔"

"آپ کو اعصابی تناؤ کی بیماری کب سے ہے؟"

یہ وقت گزارنا چاہ رہا ہے تاکہ اس کا ساتھی کمک لے کر آ سکے۔ اس کا ریوالور تو میرے ہاتھ میں ہے اور وہ لوگ گیٹ سے ہی آ سکیں گے۔ اب مجھے صرف گیٹ پر آنکھیں مرکوز رکھنی

ہیں۔ جیسے ہی وہاں کوئی آتا ہوا دکھائی دیگا اس اجنبی کو کمرے میں لے جاکر کمرہ بند کر کے الارم بجادوں گا۔ تین منٹ میں پولیس آجائے گی۔ پھر بھی خطرہ تو ہے ہی۔

"آپ اعصابی تناؤ کا شکار کب سے ہیں؟"

پچھلے سات برسوں سے۔"

"کیوں؟" اس کا اصرار بڑھتا ہی جارہا تھا۔

"دراصل میں بہت حساس قسم کا انسان ہوں اور آفس سے آنے کے بعد گھر میں کسی تفریح کے بغیر سو جاتا ہوں۔ تھکن ہوتی نہیں جو گہری نیند لائے۔یادیں ویسے بھی نیند کو دور بھگاتی ہیں۔"

"آپ کو کیا یاد آتا ہے؟"

انور خاموش ہو گیا۔ اسے لگا جیسے وہ ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہے جس پر کہیں کہیں برف جمی ہے۔ سورج کبھی بادلوں میں سے نکل آتا ہے تو کبھی اپنا چہرہ چھپالیتا ہے۔ پہاڑ پر اونچے اونچے دیودار کے درخت آسمان کی طرف سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ نیچے وادی میں ایک چھوٹا سا دریا بہہ رہا ہے جس کے کنارے سفید اور کتھئی گائیں پانی پی رہی ہے اور ندی میں ایک ناؤ آہستہ روی سے بہہ رہی ہے۔ وادی میں اودے اودے نیلے نیلے، پیلے پیلے پھولوں کے ساتھ سفید سفید پھول بھی کھلے ہیں اور گلابی پھول بھی۔ سامنے کی پہاڑی ڈھلان پر چھوٹے چھوٹے لکڑی کے مکانات کا سلسلہ ہے جس میں کسی کسی گھر سے دھواں بھی اٹھ رہا ہے۔ یہ منظر اس نے بچپن میں ایک کیلنڈر کی سینری میں دیکھا تھا۔

"آپ کو کیا یاد آتا ہے؟" وہ اپنا سوال بھولا نہیں تھا۔

یقیناً یہ ایک شاطر انسان ہے اسے خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ایک اوسط درجے کی عقل والا نیک انسان ہوں اور اس کی چالاکی کو بھانپ نہیں سکتا۔ لیکن میں اتنا احمق نہیں ہوں۔ میری نگاہیں گیٹ پر جمی ہوئی ہیں۔

انور نے اپنا خوف کرنے کے لئے بظاہر بہت نارمل طریقے سے دریافت کیا۔

"کچھ آپ بھی تو بتایئے آپ کو کیا یاد آتا ہے؟"

وہ یہ سوال سن کر چپ رہا۔ دیر تک خاموش رہا، پھر دھیمے دھیمے بولا۔

"اماں ابا بہت یاد آتے ہیں۔ میں نے انہیں کوئی سکھ نہیں دیا۔ گاؤں میں ہمارے پاس

تھوڑی سی زمین تھی، لیکن وہ بھی ٹکڑوں میں بٹی، ادھر اُدھر بکھری ہوئی۔ ابا زمیں دار کے "مقدم" تھے۔ زمیں دار نے زمیں داری کے خاتمے پر سیر کی زمین کے بے ضابطہ ٹکڑے ابا کے حقِ خدمت میں دیئے تھے۔"

"آپ اردو اچھی بول لیتے ہیں۔" انور نے اسے خوش کرنے کے لئے کہا۔

خلافِ توقع اس جملے سے وہ اداس ہو گیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اماں ابا نے زندگی کا بعد والا حصہ غربت میں کاٹا۔ شروع کا حصہ کیسے گزرا، مجھے علم نہیں کہ اس وقت میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ گاؤں کی زندگی کی چند باتیں ابھی بھی یاد آتی ہیں اور دیر تک رنجیدہ رکھتی ہیں۔"

انور اس کے چہرے کی طرف اشتیاق سے دیکھنے لگا۔

"فصل کا گیہوں کٹ کر آتا تو اماں عشر کے گیہوں نکال کر پڑوس کے غریبوں کے گھروں میں گیہوں بھرے مٹکے بھجواتی تھیں۔ خالی مٹکے لے کر میں ہی آتا تھا۔ شب برات میں گاؤں کے ہر گھر پر چراغ جلانے والے لڑکوں کی ٹیم کی سربراہی بھی میرے سپرد تھی۔ ہم لڑکے لوگ چراغ جلا کر بھاگتے ہوئے سنسان اندھیرے کھیتوں میں کھڑے ہو کر گاؤں کو دیکھتے تو ایسا لگتا جیسے ہوائی جہاز سے رات کا شہر دیکھ رہے ہیں۔"

"کیا آپ ہوائی جہاز میں بیٹھے ہیں؟"

"نہیں انگریزی رسالوں میں جہاز سے رات کا شہر کیسا نظر آتا ہے، وہ تصویریں دیکھی ہیں"

"پھر...... اور کیا کیا یاد آتا ہے؟"

وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ نرم تھی اور داڑھی کے بڑھے ہوئے بالوں کے باوجود واضح تھی۔ اجنبی بولا، "اب آپ بتائیے کہ آپ کو کیا کیا یاد آتا ہے؟"

انور چپ ہو گیا۔ ذات کے نہاں خانوں میں خود تو جھانکا جا سکتا ہے، دوسرے کو شریک کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کی بات کا کیا جواب دوں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس چکر میں آنکھیں گیٹ سے ہٹ جائیں۔ اس کی جیب میں ایک پستول اور ہو سکتا ہے۔ یہ خیال اسے ابھی ابھی آیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں دبے پستول کو مصنوعی تعریفی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"بالکل کمپنی کا بنا لگتا ہے۔"

"جی ہاں! بہت سے قصبے ایسے ہیں جہاں یہ کٹے بہت عمدہ طریقے سے بنائے جاتے ہیں۔ دراصل پولیس لائن کی بھولی بسری بندوقیں اور رائفلیں جن کے وارث برسوں پہلے مر چکے ہوتے ہیں، اونے پونے داموں چرا کر بیچ دی جاتی ہے۔ ایک بندوق کی نال سے چار یا زیادہ سے زیادہ پانچ کٹے بن جاتے ہیں۔ اصلی چیز نال ہی ہے۔ گھوڑا اور اسپرنگ اور لکڑی یا لوہے کا ہینڈل بنانا کوئی اہم بات نہیں ہے'

"اس کی مار کتنی دور تک ہے؟"

"یہاں سے گیٹ تک کا آدمی مار سکتا ہے۔"

انور کے منہ سے ایک دبی دبی سی سسکی نکلی۔ یہ مجھے باور کرانا چاہتا ہے کہ اگر کوئی گیٹ پر آکر مجھے مارنا چاہے تو میں بچ نہیں سکتا۔ ایسے موقعے پر اسے اعتماد میں لینا ہی بہتر ہوگا۔ انور اپنے اس فیصلے سے دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔

"آپ کی ماں گاؤں میں رہتی ہیں؟"

وہ آدمی چپ ہو گیا۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور سینہ ہانڈی کی طرح کھولنے لگا۔

"ارے ارے۔ آپ رو کیوں رہے ہیں، کیا وہ نہیں رہیں؟"

"پچھلے سال عید کے دوسرے روز ان کا وصال ہوا۔ رمضان کے پورے روزے رکھے تھے اور افطار کے وقت میرا انتظار کرتی تھیں۔ میں شہر سے وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ گاؤں میں کچھ ہے بھی نہیں۔ عید کے دوسرے دن انہوں نے پڑوس کے تمام گھروں میں سویاں بھیجیں۔ دن بھر میرا انتظار کیا۔ انہیں جمعۃ الوداع والے دن سے تیز بخار تھا۔ عشاء تاخیر سے ادا کی اور صبح فجر میں نہیں اٹھیں۔ نائن نے صبح کو دس بجے دروازہ تڑوایا۔ وہ مصلّے پر سجدے کی حالت میں انتقال کر چکی تھیں۔"

اب اس کے آنسو باقاعدہ گر رہے تھے۔ انور کا ہاتھ بے اختیار اس کے کاندھے پر چلا گیا۔ انور کے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے اس کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں۔

انور آہستہ آہستہ اس کے سر کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ ان باتوں سے اس کا چہرہ نارمل ہوتا جا رہا ہے۔

"ابا بھی میرے سر کے بالوں سے ایسے ہی کھیلتے تھے۔ لیکن آپ تو میرے ہی ہم عمر ہیں بلکہ مجھ سے بھی چھوٹے لگتے ہیں۔"

چاند اب درختوں کے اوپر آگیا تھا اور لان کی گھاس کا ایک ایک تنکا واضح نظر آرہا تھا۔

"آپ کو نیند کیوں نہیں آتی، آپ نے بتایا نہیں؟" اسے پھر اپنا سوال یاد آگیا۔

اس نے پھر وہی نازک سوال کر لیا۔

انور اس سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن یہ بات تفصیل طلب تھی اور انور کو خدشہ تھا کہ اتنی باریک تفصیلات شاید وہ نہ سمجھ سکے۔

"دراصل میں ذہنی طور پر کچھ بیمار رہتا ہوں۔ سوچتا ہوں تو دیر تک سوچتا رہتا ہوں۔ کہیں بیٹھا ہوں تو دیر تک بیٹھا رہتا ہوں۔ قوتِ فیصلہ بھی بہت کمی ہو گئی ہے۔ کس وقت کیا کرنا چاہئے، فیصلہ نہیں کر پاتا۔"

"لیکن آپ نے میرا پستول تو ابھی تک اپنے پاس ہی رکھا ہے۔" وہ مسکرا کر خوش دلی سے بولا۔

انور اپنی ذہانت کے اس اعتراف پر خوش ہوا۔ پھر اس نے پستول اس کی گود میں ڈال دیا جو وہیں کا وہیں پڑا رہا۔

وہ دونوں دیر تک چاند، درختوں اور پرچھائیوں کو دیکھتے رہے اور رات کے سناٹے کی آوازیں سنتے رہے۔ اچانک انور کو لگا اسے نیند آرہی ہے۔ اسے یہاں چھوڑ کر اندر جا کر سونا خطرے سے خالی نہیں۔ یوں بھی اس میں بداخلاقی کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

برابر بیٹھے شخص نے آہستہ سے اس کا سر اپنے کاندھے پر رکھا۔ اس آدمی نے اپنے کریچ کے جوتوں کے بند کھولے اور جوتے ایک طرف رکھ کر ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر پیروں کو آہستہ آہستہ ملنے لگا۔ گھاس پر اس کے پیروں کی نرم رگڑ سے ایک عجیب طرح کی دھیمی دھیمی موسیقی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

"ارے اٹھ بھی چکیے۔ یہاں برآمدے میں کیوں سو رہے ہیں؟" بیوی کی آواز سے وہ جاگا۔

رات کا بھیانک خواب یاد آیا، پھر بھی اس نے احتیاطاً پوچھا۔

"کیا بجا ہے؟"

"تھوڑی دیر پہلے ہی تو فجر کی اذان ہوئی ہے۔ بچوں کو اسکول کے لئے جگا چکی ہوں۔"

"تم گھر میں دیکھ کر آؤ کہ چوری تو نہیں ہوئی ہے۔" بیوی ہکابکا کھڑی رہ گئی۔ پھر تیزی سے مڑ کر گھر میں گھس گئی۔ چند ہی لمحوں میں واپس آکر بولی:

"آپ کے دماغ کو کیا ہو گیا ہے؟ گھر میں سب کچھ اپنی جگہ پر موجود ہے۔ صرف ایک چیز گھر سے غائب ہے۔"

"کیا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ۔ اور کون...!" بیوی نے کھلکھلا کر کہا۔

وہ بیوی کے ہنسنے پر خوش ہو کہ خاموش رہے، ابھی وہ یہ فیصلہ کر ہی رہا تھا کہ اسے سیڑھیوں کے پاس کریچ کے سفید جوتے نظر آئے۔ اس نے بیوی کی نظر بچا کر جوتے نالی میں سرکا دیے۔

"اندر بہت حبس تھا۔ آنکھ کھلی تو باہر آکر بیٹھ گیا اور نیند آگئی۔"

"آپ تو عجیب عجیب تماشے کرتے ہیں۔" بیوی نے ہونٹ سکوڑ کر بیزاری سے کہا۔

وہ خاموشی سے اٹھا اور گھر کے دروازے میں یوں داخل ہوا جیسے تماشا دکھانے کے بعد سرکس کے جانور اپنے پنجرے کی طرف آپ ہی آپ چل دیتے ہیں۔

OO

چمک

جب میں چھوٹا تھا اور غالباً چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا اس وقت سے رحمت لوہار کو جانتا ہوں۔ رحمت کے ساتھ لوہار کا لفظ دراصل اس کے والد کے انتقال کے بعد جڑا گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اب یہ اپنے گھر کا بڑا ہو گیا ہے۔ ہم دونوں بھائی کہ وہ مجھ سے بڑے اور اس خاندان کے زیادہ قریب تھے، روزانہ شام کو فرصت کے وقت ان لوہاروں کی دوکان میں جا کر ان کا ہاتھ بٹاتے۔ کیوں کہ ہم دونوں درگاہ والے میاں کے بیٹے تھے اس لئے ان کی دوکان پر ہماری بہت آو بھگت ہوتی تھی۔ ہاتھ بٹانے والی بات کا معاملہ یہ ہے کہ رحمت کے باپ نورو لوہار دھونکنی پھونکتے۔ منہ سے نہیں پھونکتے تھے۔ ایک بڑا سا پہیہ تھا اسے چلاتے رہتے تھے۔ اس کے چلنے سے ہوا بھٹی میں داخل ہوتی جو پتھر کے کوئلوں کو دہکائے رکھتی اور تب اس میں لوہا گرم کیا

جاتا۔ جب لوہا بالکل سرخ ہو جاتا، اتنا کہ نظریں نہ ٹھہر سکیں اور دیدوں میں صرف دیکھنے سے ہی جلن محسوس ہونے لگے تو نورو لوہار اسے لوہے کی سنڑسی سے باہر نکال کر فولاد کے گھوڑے پر رکھتے اور ان کے سامنے کھڑے ہو کر ان کا بیٹا لوہے کا گھن سر سے اونچا اٹھا کر اس سرخ لوہے پر مارتا، مارتا رہتا۔ چنگاریاں اڑتیں جو کبھی کبھی کپڑوں میں بھی گھس جاتیں اور لباس میں ایسے سوراخ ہو جاتے جن کے چاروں طرف کا کپڑا کمزور اور سیاہ پڑ جاتا تھا۔ نورو لوہار کا کہنا تھا کہ ہتھوڑا چلانے سے بازو کی مچھلیاں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ اڑتی ہوئی سرخ چنگاریاں اور بازوؤں کی مچھلیوں کی مضبوطی۔ یہ دو باتیں ایسی تھیں جو ہمیں ان کی دوکان کی طرف کھینچتی رہتی تھیں۔ میرے بڑے بھائی گھن کی چوٹ بہت زوردار لگاتے تھے۔ میں اتنی زوردار چوٹ نہیں لگا پاتا تھا کیوں کہ میں نسبتاً کم طاقتور تھا۔ دوسرے مجھے ہمہ وقت یہ خطرہ رہتا تھا کہ گھن بدک کر کہیں نورو لوہار کے بھیجے کو پاش پاش نہ کر دے۔ نتیجتاً میری چوٹ میں وہ بے خوفی اور صحیح نشانہ نہیں تھا جو بڑے کی چوٹ میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی دوکان میں بڑے بھائی کی زیادہ خاطر اور مان دان تھا ۔ دوکان میں اس بات کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا کہ ہم لوگوں کی اس کسرت یا کام کا علم گھر کے کسی فرد کو خاص طور سے میاں صاحب کو نہ ہو سکے ورنہ شامت ہی آجاتی۔ دوکان کی اس قربت کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے بڑے بھائی کو یہ خاندان اپنے خاندان کے اندرونی معاملات میں بھی دخیل کرنے لگا اور وہ وہاں کے چھوٹے موٹے مسئلے سلجھانے لگے۔ کبھی کبھی ان کو وہاں کے مسائل سلجھانے میں اتنی دیر لگ جاتی کہ ماں انتظار کرتے کرتے ناراض ہو جاتیں اور کسی کو بھیج کر میاں کے فرضی غصے کی اطلاع دے کر انہیں بلا پاتیں۔ بھائی اس وقت لڑکپن سے دامن چھڑا کر جوانی میں قدم رکھ رہے تھے۔

رحمت کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ یہ خاندان قصبے سے باہر ہندوؤں کے گاؤں میں رہتا تھا جہاں مسلمانوں کا واحد مکان انہیں کا تھا۔ ہم اس شادی میں گئے تھے۔ شادی کے بعد نورو لوہار نے گاؤں کا گھر اور آدھی زمین بیچ کر قصبے میں پڑوس کا ایک گھر خرید لیا۔ رحمت کی دولہن لڑکی عمر کی تھی۔ دبلی پتلی اور خوب بولنے والی۔ ہم دونوں بھائیوں کا دل اس کی باتوں میں خوب لگتا تھا۔ رحمت باپ کے کام میں اب مدد کم کرتا تھا اور اپنی نئی نویلی دلہن کے نخرے زیادہ اٹھاتا تھا۔ شام کو کلھڑ میں آدھا کلو دودھ اور دونا بھر کے جلیبیاں تو ضرور ہی لے جاتا تھا۔ نورو لوہار اور ان کی بیوی کو نئے زمانے کی یہ حرکتیں پسند نہیں تھیں۔ دل پر پتھر رکھ کر وہ یہ پسند بھی کر لیتے لیکن

رحمت نے ایک قدم یہ اور اٹھایا کہ ایک ہی گھر میں چولہا الگ کر لیا۔ دوسرا قدم، جیسا کہ مجھے یاد پڑتا ہے، کچھ یوں تھا کہ اس نے باپ کے ٹھیے پر گھنیائی کا کام تقریباً بند کر دیا۔ اب ان کے فولادی گھوڑے پر بڑے بھائی گھنیائی کرتے یا میں۔ لیکن ہم لوگ ان کو پڑھائی کے بعد کا ہی وقت دے سکتے تھے۔ کبھی کبھی جب نور و لوہار بہت آزردہ نظر آنے لگتے تو ان کے بوڑھے پھونس باپ سے رہا نہ جاتا۔ وہ دکان کے صحن میں پڑی کھری چارپائی سے اٹھ کر دھوتی کی لانگ مضبوطی سے باندھ کر آتے اور نور و لوہار کے سامنے تن کر کھڑے ہو جاتے۔ نور و لوہار ان سے کہتے کہ ابا آپ سے اب گھن نہیں چلے گا۔ میں گھن چلاتا ہوں آپ لوہا ڈھالیں۔ نور و لوہار کے ابا کہتے کہ میری آنکھوں سے اب اتنا نظر نہیں آتا۔ صرف گھن اور گھوڑا نظر آتا ہے۔ تو پہیہ چلا، لوہا گرم کر سڑانسی سے پکڑ کر گھوڑے پر رکھ میں گھن چلاؤں گا۔ ان کی عمر نور و لوہار کے قول کے مطابق ۱۲۰ سال کی تھی۔ قصبے کے دوسرے لوگ انہیں ۸۰ سال کا بتاتے تھے۔ نور و لوہار خود کو پچاس سال کا بتاتے تھے لیکن اس حساب سے وہ اپنے قول کے مطابق اپنے باپ سے ۷۰ برس چھوٹے نکلتے تھے۔ وہ یہ ماننے پر کبھی راضی نہیں ہوئے اور نہ اپنے باپ اور اپنی عمر میں کوئی کمی بیشی کی۔ ہم لوگ سمجھ دار ہو گئے تھے۔ اور ہم دونوں بھائی اکثر اس مسئلے پر گفتگو کرتے کہ نور و لوہار نمازی ہونے کے باوجود اپنے باپ اور اپنی عمر کے بارے میں جھوٹ بولتے ہیں۔ میرے بڑے بھائی مجھے یہ کہہ کر چپ کر دیتے تھے کہ ہم نے ان کے باپ کو پیدا ہوتے دیکھا نہ نور و لوہار کو۔ اس لئے ہم پوری تحقیق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ میں ان سے کہتا کہ ستر سال کی عمر میں بھلا کہیں بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ مجھے کچھ پیغمبروں کے نام بتاتے۔ پیغمبروں کے ناموں کا معاملہ آتے ہی میں خاموش ہو جاتا بلکہ نور و لوہار اور ان کے باپ کے سلسلے میں میرا رویہ کچھ عقیدت مندانہ سا ہو جاتا۔

لیکن یہ رویہ، رحمت کے بارے میں ہرگز نہیں تھا۔ رحمت کی کاہلی کے سبب نور و لوہار کو جو تکلیف ہوتی اور ان کے سوکھے، جھریوں بھرے باپ کو جو گھنیائی کرنا پڑتی اس کی وجہ سے میں رحمت سے متنفر ہو گیا۔

ایک دن صبح صبح میاں نے اٹھایا اور کہا کہ جاؤ نور و لوہار کے گھر ہو آؤ ان کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ ہم لوگ بھاگے بھاگے گئے۔ جنازہ تیار تھا۔ نماز ہوئی اور مکا کے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں پہ ہوتا ہوا، بارش میں چھل چھل کرتا جنازے کا جلوس ایک ویران باغ میں پہنچا۔

وہاں ایک قبر کھدی ہوئی تیار تھی۔ قبر سے کچھ چھوٹی بڑی ہڈیاں اور ایک کاسہ سر بھی بر آمد ہوا تھا جو ایک طرف رکھ دیا گیا تھا اور وہاں موجود افراد اندازے لگا رہے تھے کہ یہ کاسہ سر کس کا ہو سکتا ہے۔ اس موضوع پر کچھ لوگوں میں تکرار بھی ہو گئی تھی۔ نورو لوہار کے ابا کا بدن ہلکا تھا۔ نورو لوہار نے قبر میں اکیلے ہی اتر کر چلا کر کہا کہ ابا کی کمر کے نیچے چادر کی تہہ لگا کر میت مجھے دے دو۔ ایسا ہی کیا گیا۔ جب نورو لوہار نے میت سنبھال لی تو لوگوں نے چادر کو بسرعت لیکن نرمی سے باہر کھینچ لیا۔ چادر دیکھ کر تکیے کا فقیر خوش ہوا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ نورو لوہار نے چند لمحوں تک باپ کی میت کو گود میں اٹھائے رکھا۔ نورو لوہار کی آنکھیں دھندلی ہو گئیں۔ پھر جانے اسے کس بات کا خیال آیا کہ آنکھیں اور زیادہ دھندلی ہو گئیں۔ جنازے میں شریک شریعت مآب لوگوں نے کہا اب اوّل منزل میں دیر نہ کرو۔ میت کو قبر میں رکھ دو۔ نورو لوہار نے بڑے بھائی کی طرف کچھ پوچھنے والے انداز میں دیکھا۔ بڑے بھائی نے بتایا کہ ایسے لٹاؤ کہ کمر قبر کی دیوار سے لگ جائے اور چہرہ سمت قبلہ ہو جائے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ رحمت اتنی دیر تک صرف گلاب کی خالی بوتل لیئے کھڑا رہا۔ اب قبر کے صندوق پر پھاوڑے سے بنے کھانچوں میں بیری کے تنے پھنسائے گئے گویا قبر کی چھت میں سوتیں ڈالی جا رہی ہیں۔ پھر ان پر آج کے تازہ کٹے گیلی گیلی خوشبو والے آم کے تختے رکھ دیئے گئے۔ اپنے باپ کو آخری بار دیکھتے ہوئے نورو کا چہرہ ایک بار پھر دھندلا گیا۔ بعد میں ایک روز انہوں نے اصرار کرنے پر بتایا کہ باپ کے مرنے کے بعد گھنیائی کون کرے گا؟ گھنیائی نہیں ہو گی تو لوہاری کا کام کیسے چلے گا؟ کام نہیں چلے گا تو خاندان کی روٹی کا انتظام کیسے ہو گا؟ بس اسی خیال سے اس وقت بہت دکھی ہو گیا تھا۔ اب ان تختوں پر کھجور کی چٹائی رکھی گئی۔ چٹائی پر تازہ توڑی ہوئی بیری کی شاخیں ڈال دی گئیں۔ سب سے پہلے نورو لوہار نے زور زور سے کلمہ پڑھ کر تین بار چلو بھر بھر کر مٹی دی۔ میں بڑے بھائی کی طرف دیکھ کر مسکرایا کہ مٹی دینے کی دعا دوسری ہوتی ہے۔ بڑے بھائی نے مجھے تیز نظروں سے دیکھا۔ میں ادھر اُدھر ہو گیا۔ جب قبر تیار ہو گئی تو اس پر وہی چادر ڈال دی گئی اور اس چادر پر قریب سے پھول توڑ کر بکھیر دیئے گئے اور قبر کی مٹی میں ہی اگربتیاں گاڑ کر سلگا دی گئیں۔ بڑے بھائی کے علاوہ سب لوگ وہاں سے ہٹ آئے۔ رات شروع ہو چکی تھی۔ مجھے اس خیال سے خوف محسوس ہوا کہ بڑے بھائی وہاں اکیلے کیا کر رہے ہیں۔ رات کو انہوں نے پوچھنے پر بتایا کہ مردے کو تلقین کرتے ہیں کہ اب منکر نکیر آئیں گے اور پوچھیں گے تیرا رب کون۔ بتانا

اللہ، پوچھیں گے تیرا دین کیا۔ بتانا اسلام۔ پوچھیں گے یہ کون ہیں بتانا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ۔ بڑے بھائی سے میں نے کئی بار پوچھا کیا حضور خود قبر میں آئیں گے یا ان کی تصویر دکھائی جائے گی۔ انہوں نے اس بات کا ہمیشہ گول مول جواب دیا۔ میں نے یہ سب باتیں سنیں تو صحن میں لیٹے لیٹے مجھے خوف محسوس ہوا۔ میں اپنا پلنگ کھینچ کر میاں کے پلنگ کے پاس لے گیا۔ لیکن اس دن سے میں نے اپنے بڑے بھائی کو مذہبی معاملات میں قابل سمجھنا شروع کر دیا۔

رحمت کی کفالت نورو لوہار کرتے تھے۔ رحمت کے کئی بچے ہو چکے تھے جو گلی میں مارے مارے پھرتے تھے۔ رحمت کی عادت چھوٹ چکی تھی اس لئے وہ اب گھنیائی نہیں کر پاتا تھا۔ شاید وہ چاہتا بھی نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ نورو لوہار نے اس کے عدم تعاون، بازار کے رویے اور اپنی بڑھتی عمر کے پیش نظر کام کو ذرا سا بدل دیا۔ اب وہ صرف لوہے کی بڑی بڑی نعلیں بناتے تھے جو گھوڑے کے سموں میں ٹھونکی جاتی تھیں۔ یہ منظر بھی دلچسپ تھا لیکن میں اب بڑا ہو گیا تھا اس لئے ایک آدھ بار دیکھنے کے بعد اس نظارے میں دلچسپی سے زیادہ ظلم کا پہلو نظر آنے لگا۔ نورو لوہار نے سمجھایا کہ ظلم ولم کچھ نہیں۔ اگر نعل نہ لگاؤں تو گھوڑے کے پاؤں سڑک پر گھس گھس کر زخمی ہو جائیں۔ اس کے باوجود اس منظر کو دیکھتے وقت مجھے ابکائی سی آجاتی۔ نورو لوہار کبھی کبھی شام کو ہم سب کے چندے سے بنی ہوئی چائے کا گھونٹ بھر کر چپ ہو جاتے۔ کریدنے پر بتاتے کہ اب نماز میں بھی پابندی نہیں ہو پا رہی ہے۔ قبر کے عذاب اور حشر کے سوالوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔ یہ کہتے کہتے ان کا چہرہ دھندلا ہو جاتا۔ ندامت کے ان لمحوں میں یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ اب کیلوں کی قیمت اور نعل ٹھونکنے کے کام میں گھوڑے والوں سے کبھی کبھی بے ایمانی بھی کرنے لگے ہیں۔ بڑے بھائی اس درمیان وطن سے باہر ملازم ہو گئے تھے۔ رحمت کے گھر والے اکثر انہیں پیار بھرا الہنا دیتے کہ اب آپ کو اتنی فرصت بھی نہیں کہ کھڑے گھاٹ گھر آکر خیریت معلوم کر لیا کریں۔ وہ لوگ بہت اصرار کرتے تو وہ ان کے گھر چلے جاتے اور کبھی کبھی میں بھی چلا جاتا۔ اس کی بیوی اب بھی بولتی خوب تھی لیکن اب اس کی باتوں میں وہ طراری نہیں رہی تھی۔

جس دن نورو لوہار کا انتقال ہوا وہ دن کئی منظروں کی وجہ سے مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس دن کی صورت حال یہ تھی کہ گرمیوں کا موسم تھا اور قصبے میں جگہ جگہ تخمی آموں کی گٹھلیوں کے ڈھیر پڑے تھے جن پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ نورو لوہار کی بھٹی خاموش پڑی تھی۔

اس میں آگ نہیں صرف راکھ بھری ہوئی تھی۔ ہوا کرنے کا پہیہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ فولادی گھوڑے پر زنگ آگیا تھا اور گھن ایک طرف پڑا تھا۔ نورو لوہار کے گھر پر ان کی میت دیکھ کر مجھے ان کی دکان کا گھن یاد آیا۔ قصبے میں رکشے چلنے لگے تھے اور یکے گھوڑے معدوم ہوتے جارہے تھے۔

نورو لوہار کی تدفین بھی اسی باغ میں ہوئی۔ جنازے میں شریک افراد نے پوچھا کہ قبر کے طاق میں مرشد کا شجرہ طریقت رکھا کہ نہیں، بخشش کے لئے بہت ضروری ہے۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ میں سب کو روک کر اکیلا بھاگا اور گھر آکر میاں سے ایک شجرہ لیا کہ نورو لوہار میاں کے مرید تھے۔ قبر کے طاق میں جس وقت جھک کر وہ شجرہ رکھ رہا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میت کی دھندلی ادھ کھلی آنکھوں میں لحظے بھر کو ایک چمک سی پیدا ہوئی ہے۔ مجھے خوف سا لگا لیکن میں بڑا ہو گیا تھا، اس چمک کو وہم سمجھ کر تدفین مکمل کرائی۔ اس بار ہم دونوں بھائیوں نے مل کر تلقین پڑھی تھی۔ عرصے تک کفن میں لپٹی وہ دھندلی دھندلی ادھ کھلی آنکھیں یاد آتی رہیں جن میں شجرہ رکھتے وقت چمک کا وہم ہوا تھا۔ پھر ملازمت کے سلسلے میں میں بھی وطن سے دور ہو گیا۔ عید بقر عید آتا تو جہاں سب سے ملتا وہیں رحمت لوہار بھی نظر آجاتا۔ باپ کی موت کے بعد گاؤں کی ہری بھری باقی ماندہ زمین بیچ کر اس نے بہنوں کے ہاتھ پیلے کردیئے تھے۔ گھر کا آدھا حصہ بیچ کر لوہاری کی دکان ٹھیک کرائی تھی اور چند برسوں کی کمائی میں ہی اپنی بارہ سالہ بیٹی اور چودہ سالہ بیٹے کا بیاہ بھی کردیا تھا۔ یہ اس کا واحد بیٹا تھا جو اس کے گھوڑے پر گھن چلاتا تھا۔ شادی کے بعد بیٹے نے گھن چلانے سے انکار کردیا اور رکشہ چلانے لگا اور قصبے سے لگ بھگ ہجرت سی کرلی۔ اس دفعہ میں نے غور سے دیکھا تو رحمت کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا اور آنکھیں میلی ہو گئیں تھیں۔ گال دب گئے تھے اور سر کے بال کم ہوگئے تھے۔ میں نے پوچھا "بھا بھی ٹھیک ہے۔"

وہ رونے لگا "آج کسی نے پانچ چھے برس بعد ان کی خیریت پوچھی ہے۔ گھر چل کر دیکھ لو۔"

گھر کے زنگ خوردہ کواڑ کھول کر اس نے اندر بلایا۔ آنگن میں ایک دبلی پتلی بکری ممیا رہی تھی۔ اسے گالی بکتا ہوا وہ اس گھر کی واحد عمارت یعنی اس جھکے ہوئے دالان میں پہنچ گیا جس میں ایک پلنگ پڑا تھا اور کونے میں ایک عدد ادھڑا ادھڑا امٹی کا لکڑی اور اپلوں سے جلنے والا

چولہا۔ اس پلنگ پر لحاف کے نیچے کوئی بچہ لیٹا تھا۔

"دیکھ میاں کے بیٹے ہیں چھوٹے والے۔ تیری طبیعت پوچھنے آئے ہیں۔" اس نے لحاف الٹ دیا۔ لحاف کے نیچے بچہ نہیں اس کی بیوی تھی۔

برسوں پہلے کی تیز طرار، چکنی چپڑی، گوری چٹی دولہن سوکھی بکری کی طرح پھٹے لحاف کے نیچے بے حواس پڑی تھی۔ اس کا سینہ بغیر کسی پہیے کی مدد کے دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ چہرہ چوسے آم کی طرح ہو گیا تھا جس میں لگی بڑی بڑی آنکھیں خوفناک حد تک پھیلی ہوئی لگ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر مجھے دیکھ کر پہچان چمکی۔ وہ شاید مسکرائی بھی۔ مگر مجھ سے زیادہ نہیں دیکھا گیا۔ میں نے کہا "لحاف ویسے ہی ڈھک لو سردی لگ جائے گی۔" رحمت نے لحاف برابر کر دیا۔ رحمت کی پانچ سالہ بچی باہر سے کنویں کا پانی بالٹی میں بھر کر لا رہی تھی جو اس نے چولہے کے پاس لا کر رکھ دیا۔ چولہے کے پاس المونیم کے کچھ برتن پڑے تھے لیکن انہیں اس حد تک چاٹ چاٹ کر صاف کیا گیا تھا کہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ کیا پکا تھا۔ رحمت نے دری کے اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹول کر ایک بڑا سا لفافہ نکالا۔ لفافے میں سے ایک ایکسرے نکال کر مجھے دکھایا اور بتایا کہ بچوں کی ماں کو پھیپھڑوں کی بیماری ہے۔

"لیکن یہ بیماری تو قابل علاج ہے" میں نے اسے بتایا۔

تب اس نے مجھے بتایا کہ کئی برس پہلے وہ بیوی کو لے کر برندابن کے مخصوص ٹی بی اسپتال میں گیا تھا وہیں ایکسرے کھینچا تھا۔ لیکن دوا دار و پابندی سے کرنا پڑتی ہے جو نہیں ہو سکی کہ گھر کا لوہاری کا کام لگ بھگ بند سا ہو گیا ہے۔ ٹھیا بھی اب ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو گیا ہے۔ روزی روٹی کا مسئلہ ہے علاج کہاں سے کرائیں۔ میں نے اس سے پوچھا ٹھیا کتنے روپے میں بن جائے گا۔ اس کے چہرے کا رنگ کچھ کھل اٹھا۔ آنکھوں میں شاید چمک بھی پیدا ہوئی تھی۔ اس نے دام بتائے۔ پھر میں نے کہا کہ پھیپھڑوں کی بیماری کا علاج اٹھارہ مہینے لگ کر کرو اور صحیح غذا دو تو بیوی پھر سے جوان ہو جائے گی۔ یہ سن کر وہ رونے کے انداز میں ہنسنے لگا۔ پھر میں نے سمجھایا کہ اس وقت سب سے اہم کام بیوی کی دوا دارو کا ہے۔ یہ زندہ رہے گی تو بچے ٹھیک سے پل جائیں گے ورنہ خدا جانے کیا حشر ہو۔

میں نے گھر آ کر والدہ سے مشورہ کیا۔ پھر علاج کے پیسے رحمت کے سپرد کر دیے گئے۔ جس وقت پیسے لے رہا تھا اس کے چہرے پر کوئی ایک بات نظر آئی جو لفظوں میں نہیں سما سکتی۔

لیکن اس بات کا تعلق خوشی سے تھا یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ بیوی کی غذا کے نام پر ماہانہ پیسوں کا انتظام الگ سے ہوا۔

بہت دن بعد وہ مجھے ملا۔ اور اصرار کر کے بھابھی سے ملانے لے چلا۔ راستے میں وہ مجھے بتا رہا تھا کہ قصبے سے برندابن کا کرایہ کتنا ہے۔ دوا کتنے میں ملتی ہے۔ مریض کی غذا پر کتنا خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جب وہ بڑے ڈاکٹر کو دکھانے برندابن لے گیا تو اس کی بیوی اس وقت اتنی ہلکی پھلکی تھی کہ رحمت نے اسے کاندھے پر چادر کی طرح ڈال لیا تھا اور بغیر رکشہ کئے اسپتال پہنچ گیا تھا۔ رکشہ کے پیسے بچا لئے تھے۔ بھابھی مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور میرے کندھوں سے لگ کر احسان مندی کے جذبے سے کچھ رونے جیسی کیفیت میں مبتلا ہو گئی۔ اس کے چہرے پر گوشت کی ایک باریک سی تہہ چڑھ آئی تھی اور اس تہہ کا اوپری رنگ گلابی تھا۔ اس کی آنکھیں بھی اب پہلے کی طرح خوبصورت لگ رہی تھیں۔ وہ پورے قد سے کھڑی تھی۔ یہ سب دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ اس بات کا بھی احساس دل کو گرماتا رہا کہ اس کی اس حالت میں میری مدد کا دخل بھی ہے۔ بعد میں مسجد کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس احساس پر مجھے ندامت بھی ہوئی تھی۔

رحمت لوہار بازار سے پان لینے چلا گیا۔ بھابھی نے مجھے بتایا کہ آپ کی والدہ نے گرمی کے دنوں میں ایک سنی پنکھا بھیجا تھا۔ مجھے گرم دواؤں سے پسینے چھوٹتے تھے۔ گرمیوں تک تو بجلی تار میں کٹیا مار کر پنکھا چلا کر آرام کیا۔ گرمیاں ختم ہوتے ہی بچوں کے باپ نے اونے پونے بیچ دیا۔ یہ سن کر مجھے بہت غصہ آیا۔ ''اب گرمیوں میں کیا کرو گی۔ تمہارا خیال ہے کہ امی اب دوسرا پنکھا خرید کر بیٹھی ہوئی ہیں کہ تم بیچتی رہو اور وہ بھیجتی رہیں۔'' مجھے غصہ آ گیا تھا۔

''اصل میں بات یہ ہے کہ یہ اب سٹہ کھیلنے لگے ہیں۔ اس کے لئے انہیں پیسے کی ضرورت رہتی ہے۔''

''سٹہ... کس چیز کا''؟ میں حیران ہوا۔

''پیسوں کا سٹہ۔ شہر سے شام کو پارٹی آتی ہے۔ پرچی پر نمبر لکھ کر یہ پیسے دیتے ہیں۔ ممبئی کے ٹیلی فون سے نمبر کھلتا ہے۔ اگر نمبر ان کے نام کا آجائے تو دس گنا ملتا ہے۔''

''کل ملا کر اب تک فائدہ ہوا کہ نقصان'' میرے لہجے میں بہت تلخی تھی۔

''فائدے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' ''آج اگر دس مل جائیں تو کل سب کا سب پھر

لگادیں گے۔ کہتے ہیں بچوں کی پرورش کا پکا انتظام کرنا ہے کہ میں مر جاؤں تو تمہیں تکلیف نہ ہو۔ کہتے ہیں میرے پورکھ تھک گئے ہیں۔" میں یہ سب سن کر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ شدید غصے کی وجہ سے میرے سینے میں کوئی ہانڈی سی ابل رہی ہے۔

رحمت لوہار پان کا بیڑا لیئے گھر میں داخل ہوا اور قریب آ کر پان دیا جسے میں نے اٹھا کر نالی میں پھینک دیا اور دل بھر کر جو بھی ملامت کر سکتا تھا کی۔ وہ اپنی صفائی میں بہت کچھ کہتا رہا جو مجھے سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ میری ساری ملامت کا دارومدار اس پر تھا کہ بیوی کی دوا اور غذا کے لئے والدہ نے پیسے دیئے تھے۔ گرمی سے بچنے کے لئے پنکھا دے دیا تھا۔ دوکان کی جگہ ٹھیک کرنے کے لئے کہ روزی روٹی کا مسئلہ نہ رہے، تم کو الگ سے پیسے دے دیئے گئے تھے۔ پھر یہ کمینہ پن کیوں کیا۔ یہ تو ایک طرح کا ہمارے سدھاپے کا فائدہ اٹھانا ہوا نا؟

اس نے سر جھکائے جھکائے جواب دیا" مجھے نہ ابگھدیائی کی عادت ہے نہ اب صحت ایسی کہ وہ گھنیائی کر سکے۔ لونڈا دوسرے شہر میں رکشہ چلانے لگا ہے۔ میری طبیعت بھی خراب رہتی ہے لوہاری کا کام اکیلے نہیں کر سکتا۔ پورا سینہ پھنک گیا ہے"۔

میں بغیر کچھ کہے گھر آیا اور والدہ سے تمام کیفیت معلوم کی۔ انہوں نے بتایا کہ ڈیڑھ سال کے علاج کو رحمت نے ڈھائی سال تک کھینچا ہے۔ وہ علاج بند کرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ہر مہینے دوا اور غذا کے نام پر جیسا تم نے بتایا تھا سلوک کر دیا جاتا ہے۔ میں واپس رحمت کے گھر پہنچا۔ اسے خوب ڈانٹا اور پڑوس کے سبھی لوگوں کو جمع کر کے ان کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ ہر مہینے میری والدہ کے پاس جا کر بھابھی کی مہینے بھر کی دوا اور غذا کا پیسہ لا کر دوا خرید کر انہیں دے دیں اور بھابھی کی غذا یعنی دو انڈے اور آدھا کلو دودھ روزانہ ان کے گھر پہنچا دیں۔ وہ لوگ خوشی خوشی راضی ہو گئے لیکن رحمت اور بھابھی کے چہرے بجھ گئے۔ میں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔

دروازے پر اس نے مجھے روک کر کہا۔" ان لوگوں کے پاس پیسہ رہے گا تو مجھے اس کا کیا فائدہ ہو گا۔ بچے بھوکے مریں گے اور میری دوا علاج بھی نہیں ہو سکے گی"

" تمہیں صرف بے روزگاری اور سٹے کی بیماری ہے جس کا علاج کوئی نہیں کر سکتا۔" وہ یہ سن کر بے حیاؤں کی طرح ہنس پڑا۔ معلوم نہیں کیوں اس کی ہنسی سے مجھے خوف محسوس ہوا۔ میں نے اس کی دل دہی کے لئے کہا کہ اگر اسے کوئی بیماری ہے تو اس کا پورا علاج میں کراؤں گا

شرط یہ ہے کہ ڈاکٹر کی صحیح رپورٹ اور نسخہ دکھاؤ۔" یہ کہہ کر میں والدہ کے پاس آکر بیٹھ گیا اور تبھی میرے دل میں ایک شبہ سرسرایا۔ اس کی بیوی کی بیماری ٹھیک ہو چکی ہے۔ اب رحمت لوہار صرف اپنے گھر کے خرچ اور بیٹے کے لئے والدہ سے روپے لے کر اسراف کرتا ہے۔ میں نے والدہ سے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ ڈاکٹر نے سرٹیفکٹ دے دیا ہے کہ رحمت کی بیوی ٹھیک ہو چکی ہے۔ اب اس کو پیسے نہ دینا۔ والدہ نے بھابھی کے ٹھیک ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

بہت دن بعد اس دفعہ عید پر آیا تو سوچا بھابھی کی حالت دیکھ آؤں۔ صحن کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ کھولا، چھوٹا سا میلا میلا صحن پار کیا اور دالان میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بچے اب کچھ سیانے سے ہو گئے تھے۔ دونوں اسی چولہے کے پاس بیٹھے المونیم کے برتنوں سے کھیل رہے تھے۔ برابر میں اسی پلنگ پر اسی لحاف کے نیچے کوئی لیٹا پھول پچک رہا تھا۔

"بھابھی" میں نے دھیمے سے آواز دی۔

بچی جو اب سیانی ہو رہی تھی، اٹھ کھڑی ہوئی اور میرے پاس آکر بولی۔ "اماں۔ پچھلے سال وہاں چلی گئی۔" اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"ارے" میں کچھ دیر کے لئے سناٹے میں آ گیا۔

"یہ کون ہے۔" میں نے لحاف کی طرف اشارہ کیا۔ میرے دل میں خیال آیا ہو سکتا ہے رحمت لوہار نے دوسری شادی کر لی ہو۔

لحاف والے نے لحاف ہٹایا۔ اس میں رحمت لوہار کا ڈھانچہ لیٹا ہوا تھا۔

"تمہیں کیا ہوا۔ بھابھی اچانک کیسے مر گئیں۔ یہ سب کیا حال بنا رکھا ہے؟" وہ دبلے پتلے منہ سے بے حیاؤں کی طرح ہنسا۔ کیوں کہ شام کا وقت تھا اور اس گھر میں اب تک دیا بھی نہیں جلا تھا اسلئے مجھے اس قسم کی ہنسی سے خوف محسوس ہوا کیوں کہ اس ہنسی میں گدھ کی کلکاری اور بھیڑیئے کی آواز کا امتزاج تھا۔ میں نے سیانی بچی سے دیا جلانے کو کہا۔ اس نے دیا جلایا تو اس ٹوٹے پھوٹے دالان کی ہر شئے کی پرچھائیں دگنی ہو کر کانپنے لگی۔ جھلنگا پلنگ قبر کی طرح لگ رہا تھا اور دالان کی شکستہ محرابیں کسی مقبرے کی طرح محسوس ہو رہی تھیں۔ پاس کھڑی سیانی لڑکی اور اس سے لگا ہوا سوکھا سا، بچپن کو پھلانگ کر لڑکپن کی طرف جاتا ہوا لڑکا مجھے دو ایسی بے قرار روحوں کی طرح لگے جو عرصے سے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ اس کی بیٹی دھیمی آواز میں مجھے بتا رہی تھی کہ قصبے میں رکشوں کا رواج اب کم ہو گیا ہے۔ تین پہیے والے سور کے منہ جیسے ٹیمپو

چلنے لگے ہیں اور بھیا اب بالکل بے روزگار ہے۔

گدھ کی طرح کلکاری مارتے والی آواز لحاف کے اندر سے ابھری۔

"مجھے آپ کا بہت انتظار تھا۔"

"کیوں"..... میں سہم گیا۔

اس نے لحاف میں ٹٹول کر ایک لفافہ نکالا۔ لفافے کو اپنی کانپتی انگلیوں سے کھولا اور ایک ایکسرے کھینچ کر میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"کیا یہ بھابھی والا ایکسرے ہے" میں نے دھندلکے میں اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" وہ لحاف کے اندر سے بولا۔ آپ کی بھابھی کے جانے کے بعد میں نے اپنا ایکسرے کرایا تھا۔ آپ کہہ گئے تھے نا کہ اگر تم کو بھی پھیپھڑوں والی بیماری ہوئی تو میں تمہارا پورا علاج کراؤں گا۔"

"تو کیا اس ایکسرے میں کچھ آیا ہے۔" اندھیرے کی وجہ سے میں ایکسرے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

لحاف میں سے ہاتھ نکال کر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"دیے کی روشنی میں دیکھیے۔"

"پہلے اپنا چہرہ کھول کر بیٹھو۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

اس نے بدقت اپنے اوپر سے پرانا لحاف کھسکایا۔ میں نے دیئے کی روشنی میں بہت مشکل سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کسی ذی روح کا چہرہ نہیں تھا۔ میں نے دیے کی طرف ایکسرے کر کے غور سے دیکھا۔ دونوں پھیپھڑوں کی جگہ مکڑی کے جالے سے بنے ہوئے تھے۔ یہ بیماری کی آخری اسٹیج ہوتی ہے۔

"اب اس بیماری کا علاج کئی سال چلے پابندی سے تو شاید ٹھیک ہو سکے۔" میں ہولے ہولے بڑبڑایا۔ میں نے دیکھا میری بڑبڑاہٹ سے وہ خوش ہوا تھا۔

تبھی وہ بولا۔ "اس بار ایک شرط ہے کہ آپ پوری بیماری کا پیسہ ایک ہی بار دے دیں۔"

میں اثبات میں سر ہلا ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایکسرے کے پار دیے کی روشنی میں اس ڈھانچے کی آنکھیں چمک اٹھیں ہیں۔ نسخہ اور ایکسرے طاق میں رکھتے ہوئے میں نے یاد کیا

کہ ایک بار میں نے کوئی کاغذ یا کتاب کسی طاق میں رکھی تھی تب بھی کسی مردے کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ بہت کوشش کی لیکن یہ یاد نہیں آیا کہ وہ کاغذ کیا تھا، وہ طاق کہاں تھا اور وہ آنکھیں کس کی تھیں۔

○○

طوفان

(سدھاکر مشرا کے نام)

ہلکے نیلے رنگ کے سمندر کے بعد گہرا نیلا پانی تھا پھر دودھیا لہریں اور ان کے بعد افق کو چھوتا اسی کے رنگ میں مدغم ہوتا بے رنگ پانی جو دور سے ساکت نظر آتا تھا۔ اور تبھی آسمان میں دور بہت دور بادلوں کا ایک بے ہنگم غول نظر آیا جیسے زمین پر بھی ایک سمندر ہے اور اوپر بھی۔ اور اسی وقت ہوا اچانک تھمی تھی۔ چند لمحوں کا وقفہ خاموشی کا تھا مگر ایسی خاموشی جس میں تیز سیٹیاں بجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ خاموشی کا وہ اجنبی اور سناٹے کو گہرا کرنے والا مختصر وقفہ ایک ایسی زبردست آواز سے ٹوٹا جیسے بے شمار درندے اپنے سہمے ہوئے شکاروں پر آہستہ آہستہ داؤں لگا کر اچانک غرا کر ٹوٹ پڑے ہوں۔

ساحل پر دنیا کا سب سے بڑا طوفان اترا اور سینکڑوں میل فی گھنٹہ کی رفتار اور گزوں اونچی لہروں کے ساتھ خدائے قہار کی زمین کے اس پورے علاقے میں پھیل گیا، درمیان میں آنے والی ہر شئے کو بہالے گیا۔ مچھواروں کی کشتیاں کاغذ کی ناؤ کی طرح لہروں کے ساتھ اوپر گئیں اور نیچے آتے تک بے وضع لکڑی کے ٹکڑوں میں بٹ گئیں اور ان کے تختے الگ ہو کر پانی کی رفتار کے ساتھ ساحل پر اندر کی سمت دھار دار ہتھیاروں کی طرح تیزی سے آگے بہنے لگے، بڑھنے لگے اور کھڑے درختوں کے تنوں کو اپنی رفتار کے زور سے آرے کی طرح کاٹنے لگے۔ ساحل کے اندر دور تک اڑاتے سمندر میں ایک جنگل سا بہنے لگا۔

ساحل کے کنارے دھان کی تیار فصل گہرے بھورے پانی میں دور دور تک ڈوب گئی۔ ناریل کے لمبے پتلے تنوں والے درختوں کی نکیلی پتیوں والی شاخیں الگ ہوئیں اور میلوں دور تک اڑتی چلی گئیں۔ بچی کھچی شاخوں کے ساتھ درخت ہواؤں سے ایسے لڑ رہے تھے جیسے غریب اور خوددار بچے اپنے سے بہت بڑی عمر والے گلی کے بدمعاش نوجوان سے الجھ پڑتے ہیں۔ تیز ہوا کے ریلوں نے کچھ درختوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا، کچھ کو زمین پر لٹا دیا اور باقی درخت اپنی ہی بدن کی لمبائی میں دو دو تین تین جگہ سے مڑ کر بوڑھے مچھواروں کی طرح خاموش کھڑے رہ گئے۔ دوسرے اقسام کے درختوں کی شاخیں چٹاخ چٹاخ کی آواز کے ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر بچھ رہی تھیں۔

طوفان کی سرخ دہشت گرد آنکھ چھ ہزار مربع کلو میٹر پر نگراں تھی اور گھوم گھوم کر امڈ امڈ کر آہستہ آہستہ ساری زمین کو ایک گہرے بھورے دلدلی ملغوبے میں تبدیل کر رہی تھی۔

بھد میلے، سرخ، نیلے اور ہرے اور چوخانے دار کپڑے پہنے سر پر سفید پرانے کپڑے لپیٹے مرد، بے جوڑ رنگوں کی ساڑی بلاوز اور چاندی کے چھوٹے چھوٹے زیور اور زنجیریں پہنے عورتیں اور آدھے بدن سے ننگے بچے زناٹے دار ہوا اور بے پناہ بارش سے بچنے کے لئے بے تحاشا بھاگ رہے تھے اور ہوا ان کے سینوں پر پیر رکھ کر انہیں بے سمت کر رہی تھی۔ بلیوں اور بانسوں پر ٹکے کچے جھونپڑوں کی چھتیں اکھڑ کر رکابیوں کی طرح فضا میں اڑ رہی تھیں اور جھونپڑوں کے اندر باہر سب ایک ہو رہا تھا۔ مویشیوں کے جھنڈ ڈکرا ڈکرا کر اور ممیا ممیا کر وحشت زدہ ہو کر ایک دوسرے کے پیٹ میں گھسے جا رہے تھے، بغیر دیکھے آگے ہی آگے بھاگنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے اور درختوں سے اور انسانوں سے ٹکرا ٹکرا کر گر رہے تھے، اٹھ

رہے تھے اور لڑکھڑا رہے تھے۔ نیچے پانی کے شیر غرا رہے تھے اور اوپر ہوا کے ہاتھی چنگھاڑ رہے تھے اور انسان اور حیوان سب کے سب فطرت سے ایک ایسی جنگ لڑ رہے تھے جس میں جانداروں کو نہیں جیتنا تھا۔

پھر گہری بھوری کیچڑ اور درختوں کی ٹوٹی ہوئی شاخوں میں سب کچھ ڈوب گیا۔ دب گیا۔

شہروں تک پہنچتے پہنچتے طوفان مدھم نہیں پڑا۔ اونچی اونچی عمارتیں تھر تھرائیں، کھڑکیوں کے شیشے چٹخے۔ عمارتوں میں بنے گھونسلوں سے پرندے وحشت زدہ ہو کر اڑے اور پھر انہیں عمارتوں کی طرف ہوا کے ریلے کے ساتھ واپس پھرے اور دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر ان کے مردہ بدن زمین پر گیند کی طرح آ رہے۔ بجلی کے کھمبے زمین سے آن ملے اور ٹیلیفون کے پتلے لوہے کے کھمبے مڑ کر سوالیہ نشان بن گئے۔ عمارتوں، سڑکوں اور سرکاری دفتروں میں شور تھا۔ سب کے وجود کے اندر اس سے زیادہ شدید تاریکی پھیل چکی تھی جیسی بجلی غائب ہونے کے بعد سڑکوں اور مکانوں اور دفتروں پر چھائی ہوئی تھی۔ طوفان کی سرخ آنکھ اپنی ہی پھیلائی ہوئی اس وحشت پر نم ہوئی اور تیز بارش میں شہروں کی سڑکوں اور شاہراہوں اور گلیوں میں کمر کمر تک پانی بھر گیا۔

☆ ☆ ☆

طوفان آیا اور گیا۔ انسانی اور حیوانی موتوں کا ایک آسان، حقیقت سے دور علاقے کے باقی ماندہ زندہ لوگوں کی آبادی کے حساب و کتاب سے بے نیاز، غیر وحشت افزا تخمینہ تیار کیا گیا اور اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے حوالے کر دیا گیا۔ مرکز نے صوبائی حکومت کی مذمت کی اور صوبائی حکومت نے مرکز کی لاتعلقی پر اعلانات جاری کیے۔

دوسرے علاقوں کی انسانی مخلوق نے اپنے اپنے گناہوں کو کم کرنے کی خواہش میں روپے، استعمال شدہ کپڑے اور پرانے جوتے ریلیف فنڈ میں دیئے۔ ولایت سے عمدہ کمبل، بستروں کی چکنی چادریں اور روئیں دار تولیاں آئیں۔ دوسری صوبائی حکومتوں نے ڈاکٹروں کے وفد اور دواؤں کی گولیاں بھیجیں۔ جگہ جگہ سے غذائی اجناس، مٹی کا تیل اور کھانا پکانے کے برتن ٹرکوں پر لد کر آئے۔ کیوں کہ انتظام کرنے والوں کو سرکاری رجسٹروں کی خانہ پری کر کے انتظامی ضابطوں کی پابندی کرنا پڑتی ہے اور اس میں ہر سطح پر نگرانی ہوتی ہے اور نگرانی کے

بعد میٹنگیں ہوتی ہیں اور پھر ان کے بعد عمل درآمد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اس لئے امدادی سامان جیسے کھانا اور دوائیں صرف ۲۰ دن تاخیر سے پہنچے۔ اخباروں نے اس بات پر واویلا مچایا جس پر تاخیر کے ذمہ داروں نے نہایت دردمندی اور دیانت داری سے اپنے اپنے دلوں میں سوچا بھی اور آپس میں ذکر بھی کیا کہ اخبار والے اگر ایسا نہ کریں تو ان کا اخبار بکے گا کیسے۔

ولایت سے آئے ہوئے نرم، گرم خوبصورت کمبل ضرورت کے علاقوں میں اس لئے نہیں بھیجے گئے کہ وہاں پانی بھرا ہوا تھا اور پانی سے کمبل خراب ہو سکتا ہے۔ ان کمبلوں کو زیادہ وقت تک اسٹور میں رکھنا بھی مناسب نہیں سمجھا گیا کہ ان میں کیڑا بھی لگ سکتا تھا۔ اس لئے انہیں شہروں کی مارکیٹ میں کم داموں پر فروخت کر دیا گیا اور اس سلسلے میں کئی سطحوں پر اور کئی معاملوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا گیا۔ عمدہ بیڈ شیٹس اور روئیں دار تولیوں کا انتظام بھی اسی دانش مندانہ طریقے سے کیا گیا کہ یہ اشیاء بلاوجہ برباد نہ ہوں۔ غذائی اجناس میں باسمتی چاولوں کا معاملہ بھی ان سے مختلف نہیں تھا۔ البتہ موٹا جھوٹا اناج اور آٹا دال ٹرکوں میں لدا کھڑا رہا کیوں کہ ان کو ضرورت کے علاقوں تک لے جانے کے لئے بہت زیادہ ڈیزل کی ضرورت تھی اور ڈیزل کی سپلائی ایسے موقعوں پر ایک مخصوص قانونِ فطرت کے تحت بند ہو جاتی ہے۔ مختلف اخباروں اور اداروں نے اس انسانی صورتِ حال کا بہت دلدوز نقشہ کھینچا، پرائیویٹ فلاحی انجمنیں پوری تندہی کے ساتھ لگ گئیں ۔ مرکز کو صوبائی عوام کی تکالیف کے خیال نے بے چین کیا اور سینکڑوں کروڑ روپیہ اس بحران کی شدت کو کم کرنے کے واسطے مختلف اعلانات کے بعد عطا کیا گیا۔ صوبائی حکومت نے اس کا پہلا حصہ سرکاری ملازمین کی تنخواہ کی شکل میں تقسیم کیا کہ اگر وہ لوگ ہی مطمئن اور تازہ دم نہیں ہوں گے تو امدادی کاموں کو انجام کون دیگا۔ باقی روپے کا بڑا حصہ بھی کچھ اسی قسم کی انسانی ہمدردی، سماجی اور معاشی اور انتظامی وابستگی اور پیچیدگی کے تصور کے تحت اس انداز سے تقسیم ہوا کہ کوئی بڑے سے بڑا حساب داں بھی پوری بات کو اور آنکڑوں کو سمجھنے کے بعد یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ امدادی روپے کا استعمال غلط ہوا۔ دیہات کے تباہ شدہ انسانوں نے بھی فوٹوگرافروں کے سامنے المونیم کے نئے برتن، آٹے کی بوریوں اور پیراسیٹامول کی گولیاں دکھا دکھا کر اس بات کو یقینی بنایا کہ امدادی کاموں کا روپیہ سارا کا سارا ادھر اُدھر نہیں خرچ ہوا ہے، اور کاموں میں بھی لگا ہے۔

پرائیویٹ انجمنوں اور مذہبی اداروں نے چھوٹے چھوٹے پیمانے پر اس ٭رانی صورت

حال کی شدت کو کم کرنے کیلیئے قابل ذکر کام کیئے۔ کچھ متمول عورتوں نے شہروں میں آکر اپنی اپنی انجمنوں کی طرف سے عارضی دفتر بنائے اور گھوم گھوم کر قریب کے محلوں میں تباہی کا جائزہ لینے گئیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ وہ اپنے اپنے مصروف شوہروں اور اپنے پر تکلف مکانوں کی آسائش سے اکتا کر اور اپنے ہم نظروں میں شرمندگی سے بچنے کے لئے ایسا کر رہی تھیں تو یہ بڑا فضول اور عامیانہ الزام ہوگا۔ بھلا پریشان حال مردوں اور عورتوں اور بچوں کے ساتھ انہیں فوٹو کھنچوانے میں کون سا رومانی عیش مل رہا تھا سوائے اس کے کہ وہ فوٹو اخبارات میں چھپ جاتے تھے تو پڑھنے والوں کو احساس ہو جاتا تھا کہ خوش حال افراد اور بدحال تباہ شدہ انسانوں میں کتنا فرق ہوتا ہے جیسے کبھی کبھی شربت میں تھوڑا سا نمک ملا دیتے ہیں کہ شیرینی کا ذائقہ کچھ کھل جائے۔

☆ ☆ ☆

کچھ پرائیویٹ انجمنوں نے نیک دل عورتوں کو اس کام پر مامور کیا تھا کہ طوفان میں جان کھونے والوں کے یتیم بچوں کو ۵۰۔۵۰ کی ٹولیوں میں کچھ دن تک اپنے پاس رکھیں اور انہیں اپنے اپنے ماں باپ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے کے اس دکھ سے نجات دلائیں جو غالباً دنیا کا سب سے بڑا المیہ ہوتا ہے۔ ان تمام اداروں نے متفقہ طور پر ایسی تمام والنٹیئر خواتین کو تربیت دی کہ ایسے یتیم بچوں کے آنسوؤں کو کیسے پونچھا جائے اور ان کے چہروں کو پرانی مسکراہٹوں سے کیسے سجایا جائے۔ ایسے تمام افراد، جن میں نرم دل ہونے کی وجہ سے خواتین زیادہ تھیں، اپنے اپنے بھولے بسرے غموں اور محرومیوں کو کم کرنے کیلیئے اور بجا طور پر ان یتیم بچوں کو خوش رکھنے اور مسکراتا دیکھنے کے لئے بڑی جانفشانی کے ساتھ اس کام میں لگ گئے۔

☆ ☆ ☆

اپنے علاقے میں پہنچ کر سب سے پہلے میں نے ماں کو ٹھیک ٹھاک پایا اور اوپر والے کا شکر ادا کیا۔ ماں میرے کندھے سے لپٹی بہت دیر تک دھیمی دھیمی آواز میں روتی رہی۔ جب میرے کندھے اس کے آنسوؤں سے بھیگ گئے تو میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ جھریوں بھرے چہرے کی آنکھیں بند تھیں اور ان سے آنسوؤں کے چھوٹے چھوٹے قطرے برابر بہہ رہے تھے۔ کسی کسی جھری پر آنسوؤں کے قطرے رک جاتے تو میں انہیں تب تک دیکھتا رہتا جب تک وہ نیچے ڈھلک نہ جاتے۔ شام تک میں نے پڑوس کے کئی گھروں میں جا کر ان کے دکھ درد سنے۔

رات کو بیٹھ کر اپنی جائیداد کے نقصان کا اندازہ لگایا اور چاروں طرف پھیلی انسانی جانوں کی بربادی کا دھیان کر کے اس نقصان کو بھلا دیا۔ رات کے پچھلے پہر کھڑکی کھولی۔ باہر پورے چاند کی رات تھی۔ میں نے دور دور تک اپنے مکان سے متصل کھیتوں اور درختوں پر نظر ڈالی۔ سر جھٹکا اور آنکھیں مل کر پھر دیکھا۔ کھڑکی کے ٹھیک سامنے بیس گز کے فاصلے پر جو درختوں کا جھنڈ تھا اب وہاں نہیں تھا۔ بہت غور سے دیکھا تو ان درختوں کی جڑیں آپس میں گتھی ہوئی نظر آئیں۔ ان درختوں کے پاس پرانی پنچایت کی عمارت مٹی کا ڈھیر ہو چکی تھی۔ پورب کی طرف کے پرانے درخت زمین نے نگل لئے تھے۔ بھوتیا بابا کا برگد تیز ہواؤں اور سیلاب میں بہہ کر میلوں دور جا چکا تھا۔ بچپن اور لڑکپن کی تمام یادوں کے نشانات ختم ہو چکے تھے۔ مجھے لگا جیسے میں اچانک خود اپنے آپ سے اجنبی ہو گیا ہوں۔ میں کھڑکی کھولے بیٹھا آسمان کو دیکھتا رہا جہاں اب ایک بھی بادل نہیں تھا۔ صرف چاند تھا۔ پیلا بدصورت چاند۔

☆ ☆ ☆

سویرے اٹھ کر میں ساحل پر جانے کے لئے روانہ ہوا جو اب بیس میل اندر آ چکا تھا۔ ندی کا ڈیلٹا کئی شاخوں میں تقسیم ہو کر سمندر سے جا ملتا تھا اور اونچی جگہ سے قدرت کی بالشت کی طرح نظر آتا تھا جو آبادی اور سمندر کے درمیان کل کل کرتی ندیوں کی چھوٹی چھوٹی شاخوں کی شکل میں رکھی رہتی تھی۔ ندی اور سمندر مل چکے تھے اور پوری زمین پر صرف ایک ہی رنگ واضح نظر آ رہا تھا۔ گہرے بھورے رنگ کا پانی جو کہیں گہرا تھا اور کہیں کہیں کیچڑ کے اوپر گھٹنوں گھٹنوں اونچا کھڑا تھا۔ پانی کے درمیان کہیں کہیں ایسے علاقے بھی تھے جہاں پانی سوکھنے لگا تھا۔ مجھے وہاں ایک کتا نظر آیا۔ میں دھیرے دھیرے اس طرف بڑھا۔ میرے ساتھ میرا بھتیجا بھی آیا تھا۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ جب وہاں پہنچے تو موت کی تیز بو ناکوں سے ٹکرائی۔ پیٹ پھولی بھینسیں اور گائیں آسمان کی طرف ٹانگیں اٹھائے پڑی تھیں۔ میں ان کی صحیح تعداد گننے کی ہمت نہیں کر سکا۔ تبھی میرے بھتیجے نے لکڑی سے اشارہ کیا کہ کتا جس پنجر سے لگا ہوا ہے وہ مویشی کا نہیں ہے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ میں نے تیزی سے بھتیجے کے ہاتھ سے لکڑی لی اور کتے کو مارنے کے لئے بڑھنے ہی والا تھا کہ مجھے خیال آیا کہ پورے علاقے میں سوکھی لکڑی اور مٹی کا تیل نہیں ہے۔ انتم سنسکار ممکن نہیں تھا۔ میں وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔ میرا بھتیجا میرے پاس آ کر مجھ سے لپٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے لکڑی پھینک دی۔ کتا ہم دونوں سے بے

نیاز اپنی بھوک مٹاتا رہا۔ میں نے جنیئو برابر کیا اور سمندر کی طرف دونوں ہاتھ جوڑ کر سنسکرت کے وہ اشلوک پڑھے جو انتم سنسکار کے وقت پڑھے جاتے ہیں اور بھتیجے کا ہاتھ اندازے سے ٹٹول ٹٹول کر پکڑا اور آنکھیں بند کئے کئے گھوم کر وہاں سے ایسے چلا جیسے اندھے چلتے ہیں۔ صبح کی روشنی پھیل رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور ناریل کا ایک نیم استادہ پیڑ دیکھا جس کی بہت سی شاخیں ٹوٹ کر اڑ چکی تھیں اور باقی ماندہ شاخیں اپنی پژمردہ لمبی لمبی پتیوں کے ساتھ ٹوٹ کر وہیں کے وہیں جڑی رہ گئی تھیں۔ پیڑ کا اوپری حصہ ہوا کے زور سے نیچے ہوتا پھر اوپر ہوتا جیسے رات بھر کی اجتماعی عصمت دری کے بعد صدمے سے چور کوئی ابھاگن بے ہوشی سے اٹھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

میں شام تک موت کی تیز حیوانی مہک کے درمیان اس کنارے سے اس کنارے تک دیوانہ وار گھومتا رہا۔ فصلیں سڑنے لگی تھیں۔ جگہ جگہ لوگوں کے جھنڈ کیچڑ اور مٹی میں دبی ہوئی بے نور آنکھوں اور پھولے ہوئے بدنوں والی انسانی اور حیوانی لاشیں نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے خشکی پر بھی بہت کم مویشی ملے۔ سڑکیں بے نشان ہو کر پانی کے نیچے بہہ چکی تھیں۔

سورج غروب ہوتے وقت میں نے سمندر کی طرف دیکھا۔ دو ادھ ننگے مرد لاٹھی اور ایک گٹھری اٹھائے کمر کمر پانی میں کنارے کی طرف آرہے تھے۔ روشنی کم ہوتی جارہی تھیں اور ان افراد کے قدموں کی حرکتیں تاریکی ہونے کی وجہ سے معدوم ہوتی جارہی تھیں۔ دھیمے دھیمے ان کے بدن تصویر بن گئے۔ صرف قدموں کی شپاشپ شپاشپ سنائی دیتی رہی۔ میں مڑا اور گاؤں کے پاس آکر رک گیا جہاں ایک نوجوان عورت کھڑی تھی جس کے پیٹھ سے لگی اس سے بھی لمبی اس کی بیٹی پیچھے سے ماں کے شانے پر سر رکھے ویران آنکھوں سے کچھ سوچ رہی تھی۔ میں عورت کے قریب گیا۔ ایک سمندر میرے پیچھے تھا اور ایک سمندر اس عورت کی آنکھوں میں تھا۔ پیچھے والا سمندر گہرا بھورا تھا اور عورت کی آنکھوں کے سمندر کے پانی میں کئی رنگ جھلملا رہے تھے۔ آشا کا سبز رنگ، زندہ رہنے کی امنگ کا ہلکا گلابی رنگ، خوف کی سیاہی اور موت کی زردی۔ ماں بیٹی نے ہم دونوں کو اتنے قریب دیکھا تو آنکھیں جھکا لیں۔ میں مڑتے وقت ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا کہ ان دونوں میں کس کی آنکھ سے پانی کا ایک شفاف قطرہ میلے میلے رخسار پر پہلے ڈھلکا تھا۔

☆ ☆ ☆

سیمنٹ کنکریٹ کے اس بڑے سے دفتر نما گھر کا دروازہ کھولا تو سامنے آرادھنا کھڑی تھی جس کے ٹانگوں سے لپٹی ہوئی اس کی ساتھ آٹھ سال کی بچی مجھے دیکھ کر "انکل" کہہ کر چلائی تھی۔ میں نے آردھنا کو تین سال بعد دیکھا تھا۔ ویسی ہی سادہ سادہ سی مسکراہٹ، اونچا شفاف ماتھا، بالوں کا بے ترتیب جوڑا اور پیروں میں چمڑے کی سینڈل۔ البتہ گھنی گھنی پلکوں والی بڑی بڑی آنکھوں میں سوچ کی تہیں گہری ہو گئی تھیں۔ آرادھنا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا۔

"آپ کب آئے۔ میں کئی دن سے سوچ رہی تھی کہ آپ کا گھر بھی تو اسی علاقے میں ہے۔ سب لوگ کیسے ہیں۔ آپ کی ماں؟۔ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

مجھے آرادھنا کا بے چینی کے ساتھ یہ سب کچھ پوچھنا اچھا لگا۔

وہ آج بہت دن بعد ملی تھی۔ اتنے عرصے بعد بھی اس نے طوفان میں پھنسی میری ماں کو یاد رکھا۔"

اندر تو بلاؤ بیٹھ کر اطمینان سے بات کریں گے۔ تم کیسے چلی آئیں۔ کسی نے منع نہیں کیا۔"

"کون منع کرتا۔ پاپا سے پوچھا تو انہوں نے خوشی خوشی اجازت دے دی۔"

ٹین کی کرسی پر بیٹھ کر میں نے آرادھنا کی بچی کو پاس بلا کر لپٹا لیا اور باتیں کرنے لگا۔ آرادھنا کی بچی میری شرٹ کے بٹن سے کھیلتی رہی۔

"میں ڈپارٹمنٹ کو بتائے بغیر، بلا تنخواہ کی چھٹی لے کر چپ چاپ آگئی۔ مجھے پچاس بچوں کو نارمل کرنے کا کام سپرد کیا گیا ہے۔"

برآمدے کے پیچھے بنے کمروں سے سانولے سانولے پژمردہ چہرے کھڑکی کی سلاخ پکڑے ہم تینوں کو دیکھتے رہے۔

"شلپا کو اپنے پاس سے ہٹا دیجئے ۔ سب بچے سمجھ رہے ہیں کہ شلپا جس کے پاس کھڑی ہے وہ اس کا............ میں تو ان بچوں کے سامنے شلپا کو اپنے پاس بھی نہیں بٹھاتی۔ شلپا بیٹا تم ان کے ساتھ جاکر کھیلو۔"

شلپا خاموشی سے ہٹ گئی جیسے کئی دنوں سے اس قسم کی تنبیہ سننے کی عادی ہو چکی ہو۔

"آرادھنا! تمہیں اس اجنبی علاقے میں ڈر نہیں لگتا۔" میں نے اپنائیت سے پوچھا۔

آرادھنا مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں ہمیشہ کی طرح سادگی تھی۔

"نہیں۔ اچھا لگتا ہے۔ اب مجھے کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔"

ہم دونوں کچھ دیر خاموش رہے۔

"بھابھی جی اور بچے کیسے ہیں؟" آرادھنا نے پوچھا۔

"سب اچھے ہیں۔ طوفان نے البتہ سب کو ہلا دیا ہے۔ وہ لوگ بمبئی میں ہی ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ تم ان بچوں کو کیسے نارمل کر رہی ہو۔"

پھر آرادھنا مجھے سمجھاتی رہی کہ کئی لوگوں کے ساتھ اس کی ٹریننگ ہوئی جس میں چائلڈ سائیکلوجی کے ڈاکٹر بھی آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ پہلے ان بچوں کو کھانے پینے کو طاقت ور چیزیں دی جائیں۔ وٹامن بھی لکھے ہیں۔ بتایا کہ یہ بچے جس طرح کے کپڑے پہنتے ہیں اس میں فرق نہ کرنا ورنہ یہ اپنی جڑ سے اکھڑ جائیں گے۔ سب سے زیادہ زور اس بات پر ہے کہ بچے صبح شام کچھ نہ کچھ کھیلیں۔ بیچ میں انہیں آسان آسان طریقے سے کچھ پڑھا دیا کرو تاکہ ان کا ذہن مصروف رہے اور سب سے اہم بات یہ کہ بچے مسکرانا سیکھ جائیں۔

"مسکرانا سیکھ جائیں؟ مطلب؟ میں حیران ہوا۔

"اپنے ماں باپ کو کھو کر یہ بہت سہم گئے ہیں۔ پورا طوفان انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کے ذہن میں وہی تصویریں گھومتی رہتی ہیں۔ کیسے مسکرائیں؟" آرادھنا دکھ کے ساتھ بولی۔

"پھر اس کے لئے کیا ترکیب کی جاتی ہے؟"

"وہ مشکل ترکیب ہوتی ہے۔ کسی کو دکھی کرنا آسان ہوتا ہے، خوش کرنا بہت مشکل۔" یہ کہہ کر آرادھنا چپ ہو گئی۔

"تم کیسے مسکرانے پر مجبور کرتی ہو۔"

"مجبور نہیں کرتی۔ بہلا بہلا کر خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔"

"بچے کیسے مسکرائے؟" میری آنکھوں میں جستجو دیکھ کر آرادھنا خوش ہو گئی۔

"ابھی بتاتی ہوں۔ ان میں ایک بچی ہے پورنیما۔ آٹھ برس کی ہے۔ دونوں ماں باپ آنکھوں کے سامنے طوفان میں بہہ گئے۔ یہ ایک پیڑ سے چپکی رہ گئی۔ بچ گئی۔ آج اسے بہت

بہلایا ہے۔ کہا ہے کہ لطیفے سناؤں گی۔ ابھی بلاتی ہوں۔"

آرادھنا اندر گئی اور ایک دبلی پتلی گول چہرے اور سانولے رنگ کی بچی کو لے کر باہر آئی جس نے اودے رنگ کا دیہاتی فراک پہن رکھا تھا۔

وہ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح ہمارے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کی ٹانگیں دھیرے دھیرے کانپ رہی تھیں۔

"پورنیما کرسی پر ہی بیٹھ جاؤ۔" آرادھنا نے ملائم آواز میں کہا۔ پورنیما برابر کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ارے ہمیں بہت پیاس لگی ہے۔ یہ ہمارے دوست ہیں تمہارے انکل۔ ہم دونوں کے لئے پانی۔ ٹھنڈا پانی اچھے والے گلاس میں لا سکتی ہو۔؟"

"ہاں" اس کا سانولا چہرہ گلابی سا ہو گیا وہ چلی گئی تو آرادھنا بولی۔

"اپنے ہاتھ سے کوئی کام کریں تو بچوں میں اعتماد جاگتا ہے۔ تبھی انہیں اپنی شخصیت پر بھروسہ ہوتا ہے۔ جب شخصیت پر اعتماد ہوتا ہے تو انسان مسکرا بھی سکتا ہے۔"

ٹین کی ایک ٹرے میں شیشے کے دو گلاسوں میں وہ میلا میلا پانی لے آئی۔

آرادھنا کے اشارے میں نے پانی پیا۔ آرادھنا نے بھی پیا۔

"پورنیما۔ ہم نے کل وعدہ کیا تھا آج تمہیں ایک جوک سنائیں گے۔ تم نے ہمیں پانی پلایا۔ ہم بدلے میں جوک سنائیں گے۔"

پورنیما کی آنکھیں ایک لمحے کو چمکیں۔

"سنو۔ ایک خرگوش تھا وہ تالاب کے کنارے گیا اور تالاب میں نہاتے ہاتھی سے بولا۔

"اے ہاتھی کے بچے باہر نکل۔ جلدی نکل۔"

پورنیما چمکتی : ۔ئی آنکھوں سے آرادھنا کے ہونٹوں کو دیکھتی رہی۔ "ہاتھی بے چارہ سونڈ ہلاتا باہر نکل آیا" یہ کہہ کر آرادھنا نے ہاتھی کی سونڈ ہلانے کی نقل اپنے ہاتھ کو لہرا لہرا کر کی۔

ہاتھی نے باہر نکل کر پوچھا۔

"میاں خرگوش! تم نے مجھے باہر کیوں بلایا۔ میں تو چپ چاپ نہا رہا تھا۔ تو خرگوش بولا ،اب تم جا سکتے ہو۔ میرا انڈرویئر کھو گیا تھا۔ مجھے شک تھا کہیں تم اسی کو پہن کر تو نہیں نہا رہے

ہو۔"

پورنیما مسکرا پڑی۔ مجھے خود ہنسی آ گئی۔ آرادھنا بھی مسرور آنکھوں سے ہنس رہی تھی۔

"اچھا پورنیما...... اب تم جاؤ۔ تمہارے پڑھنے کا ٹائم ہو رہا ہے"

وہ اٹھ کر دھیمے دھیمے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

تب آرادھنا نے بتایا "پچھلے دو ہفتوں سے دن رات لگی ہوئی ہوں تب یہ بچے مسکرائے ہیں بس ایسے ہی کسی نہ کسی طرح ان کو ان کی شخصیت پر بھروسہ دلا کر انہیں اچھی اچھی چھوٹی چھوٹی باتوں کے ذریعہ خوش کر کے مسکرانے پر لے آتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے ٹریننگ کے دوران بتایا تھا کہ اتنی بڑی ٹریجڈی کے بعد بچے مسکرائے نہیں تو ان کی آتما پر تالے پڑ جاتے ہیں۔ یہ اکیلی بچی تھی جو اب تک نہیں مسکرائی تھی۔ آپ کے آنے کی برکت سے یہ مرحلہ بھی آسان ہو گیا ورنہ کل بہت مشکل ہوتی۔"

"کیوں۔ کیا مشکل ہوتی؟"

"کل ان سب بچوں کا گروپ فوٹو ہو گا جو ایک بڑے میگزین میں چھپے گا اور ان بچوں کی مدد کے لئے ریلیف فنڈ کی اپیل بھی چھپے گی۔ فوٹو گرافر کہتا "اسمائل" اور یہ لوگ چپ چاپ کھڑے رہتے تو مجھے کتنا افسوس ہوتا کہ اتنے سارے دنوں کی محنت برباد گئی۔"

"سرکار سے بھی تو ریلیف فنڈ ملا ہو گا۔" میں نے پوچھا۔

"مجھے ریلیف فنڈ جمع کرنے والے کاموں کا کوئی تجربہ اور معلومات نہیں ہے۔ سرکاری ریلیف کا حال آپ کو بھی معلوم ہے۔ پھر ایک بات اور بھی ہے کہ جس آرگنائزیشن کو میں نے اپنی ایک مہینے کی خدمات والنٹیئر کی ہیں وہ یتیم بچوں کا کام سنبھالنا چاہتی ہے اس لئے وہ اپنا ریلیف فنڈ الگ سے بنانا چاہتی ہے۔ کل آپ بھی آجایئے گا۔ کچھ دیر اچھا وقت کٹ جائیگا۔ ان لوگوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

"ضرور آؤں گا۔ اب چلوں۔ ماں انتظار کر رہی ہوں گی۔ تم بھی گھر آؤنا"

"پھر آؤں گی۔ ان بچوں کو ایک منٹ بھی چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔"

گھر پہنچ کر رات کو میں نے پھر کھڑکی کھولی۔ آج بھی چاندنی خوب تھی۔ مجھے آرادھنا کی باتیں یاد آنے لگیں۔ آرادھنا عزت نفس والی شریف نیک دل لڑکی تھی۔ شوہر نے جب دن رات بے عزتی شروع کر دی تو وہ خاموشی سے عدالت کے ذریعہ اپنی بچی کو لیکر الگ

ہو گئی۔ معاشی طور سے اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ اسے شوہر سے زیادہ تنخواہ ملتی تھی۔ آج سے تین برس پہلے اس سے ایک سرکاری میٹنگ کے لنچ میں ملاقات ہوئی تھی۔ پھر دو ایک مرتبہ اور بھی ملاقاتیں ہوئیں۔

اس کی ذاتی زندگی کی تفصیلات کا مجھے زیادہ علم نہیں تھا مگر اس کی سادگی اور نیک دلی نے مجھے ہر ملاقات میں متاثر کیا تھا۔

کھڑکی کے باہر چاندنی رات میں مجھے پھر اپنے بچپن اور لڑکپن کی یادگار جگہوں کے نشانات کے کھنڈر نظر آئے۔ میرا دل پھر اداس ہو گیا۔ تبھی مجھے ایسا لگا جیسے میرے دماغ میں ایک روشنی کا جھماکا ہوا ہو۔

ان بچوں کے ماں باپ ان کی آنکھوں کے سامنے ختم ہوئے ہیں تب بھی یہ مسکرا رہے ہیں۔ آرادھنا کتنی محنت سے ان کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ میں مرد ہوں۔ مٹی کے کچھ گھر، کچھ درخت اگر نہیں رہے تو کیا میں انہیں زندگی بھر یاد کر کے اداس ہوتا رہوں گا۔ آنکھیں بند اسی ہونے لگی تھیں۔ میں نے آہستہ سے کھڑکی بند کی اور سونے جاگنے کی کیفیت میں محسوس کیا کہ دل کسی ایک لمحہ کے لئے بہت مطمئن ہو جاتا ہے اور پھر دوسرے ہی لمحے بہت بیزار۔ اسی کیفیت میں صبح ہو گئی۔

گیارہ بجے جب میں آرادھنا کے دفتر پہنچا تو وہاں کیمرہ مین اور ریلیف آرگنائزیشن کے لوگ پہنچ چکے تھے۔ آرادھنا نے میرا سب سے تعارف کرایا۔ وہ لوگ گرم جوشی سے ملے اور بتاتے رہے کہ کیسے انہوں نے بارہ سال پہلے بھی اسی علاقے میں یتیموں کا کام سنبھالا تھا اور کس طرح انہوں نے مغربی گھاٹ کے زلزلوں کے بعد وہاں کے پچاس بچوں کے واسطے زبردست ریلیف مہم چلائی تھی۔

ٹائی باندھے ہوئے ایک شخص نے بہت اعتماد کے ساتھ اسے بتایا کہ ریلیف کا کام آسان نہیں ہوتا۔ کسی کی جیب سے پیسہ نکالنا آج کے زمانے میں بہت مشکل کام ہے۔ لیکن ہم لوگ اسپیشل طریقے سے میڈیا کے ذریعے لوگوں کے دلوں کو موم کر لیتے ہیں۔ آپ تھوڑے دن بعد میگزین کا اشو پڑھئے گا تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ صرف اسی ایک فوٹوگراف کے چھپنے کے بعد چیک اور ڈرافٹ کا تانتا لگ جائے گا۔ ہماری آرگنائزیشن سے بہتر کوئی بھی ریلیف فنڈ نہیں جمع کر سکتا۔

ٹائی والے شخص نے اپنی سنہری گھڑی میں وقت دیکھااور فوٹوگرافر سے کہا۔
"آپ ہمارے لئے نئے فوٹوگرافر ہیں۔ اس لئے آپ کو بتارہے ہیں کہ دو تین فوٹو ایک ساتھ لے لیجئے گا۔ کبھی کبھی ایک آدھ ہل کر خراب بھی ہو جاتا ہے۔"
فوٹوگرافر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ابھی دس پندرہ منٹ اور رک جایئے۔ دھوپ تھوڑی اوراوپر آجائے۔"
"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" اس نے بے چینی سے کہا۔ "مگر جلدی کیجئے۔ اس سے زیادہ دیر نہیں۔ آج ہمیں چار گروپس کے فوٹوگراف لینا ہیں۔ انہیں کاموں میں کئی دن سے سو نہیں سکا ہوں۔ یہ سب کام آسان نہیں ہوتے۔ جی جان ایک کر دینا پڑتا ہے۔"
فوٹوگرافر کیمرہ فٹ کرنے لگا۔
میں ٹائی والے شخص کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھ گیا۔
"مجھے یہ دیکھ کر بہت اچھا لگا کہ آرادھنا نے تمام بچوں کو خوش کر دیا ہے۔ کل وہ آخری لڑکی بھی مسکرائی جواب تک نہیں مسکرائی تھی۔"
آرادھنا اندر ہال میں بچوں کو تیار کر رہی تھی۔
"جی ہاں۔ جی ہاں۔ دراصل وہ پورا کام ہمارے ایک اور اسپیشلسٹ دیکھتے ہیں۔ میں صرف فوٹوگراف کراکے میگزین سے رابطہ کر کے چیک وصول کر کے بینک میں ڈالتا ہوں۔"
مجھے یہ ساری باتیں سن کر اچانک بیزاری سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے ہال کی طرف دیکھا جہاں سے ابھی آرادھنا مسکراتے ہوئے بچوں کو لے کر باہر آئے گی۔
تبھی آرادھنا بچوں کو لے کر باہر نکلی۔ سب کے منہ دھلے ہوئے تھے اور کنگھی کی ہوئی تھی اوران میں سب کے سب مسکرانے پر آمادہ نظر آرہے تھے۔ آرادھنا نے آتے آتے رک کر مڑ کر سب بچوں کو دیکھا۔ سب کو خوش دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان کا اجالا پھیل گیا۔
تمام بچے قطار سے کھڑے ہو گئے۔ ٹائی والا شخص باہر اپنے ڈرائیور سے بات کرنے گیا ہوا تھا۔ آرادھنا میرے پاس کھڑی تھی۔ شلپا کو اس نے اپنے کمرے سے باہر نہیں آنے دیا تھا۔ فوٹوگرافر لمبائی کے حساب سے سب کو ترتیب میں کھڑا کر رہا تھا۔
"آج تو آرادھنا! یہ سب مسکرا رہے ہیں۔ اسی لئے تم بہت خوش ہو؟"

آرادھنا نے ہولے سے "ہاں" کہا اور میری طرف ممنون نگاہوں سے دیکھا جیسے اپنی کارکردگی کی تعریف پر خاموش شکریہ ادا کر رہی ہو۔

پھر اس نے دھیمے دھیمے کہا" میں نے خود اتنے دکھ جھیلے ہیں کہ میرا جی یوں بھی چاہتا ہے کہ بچے سدا مسکراتے رہیں۔ کوئی انہیں دکھی نہ کرے۔ سمندر کا طوفان ہفتے بھر میں ختم ہو جاتا ہے پر اس کے زخم پانچ سات برس میں بھر پاتے ہیں۔ لیکن آتما کے طوفان کی بھرپائی جیون بھر نہیں ہو پاتی۔ زندگی ایک ناسور بن جاتی ہے۔" اس کی گہری گہری آنکھیں چھلکنے کے قریب تھی۔

"میں تمہاری باتیں سمجھتا ہوں۔ لیکن کیا یہ کامیابی کہ تم نے پچاس یتیم بچوں کو ہمیشہ کے لئے مسکراہٹ دے دی، تمہارے، بہت سے دکھوں کو دور نہیں کردے گی؟"

میں نے اس کے کانپتے ہوئے ٹھنڈے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"ہاں کردے گی۔" وہ موٹی موٹی آنکھوں سے مسکرائی۔ "اسی لئے تو میں بہت خوش ہوں بلکہ کل شام سے خوش ہوں جب وہ آخری بچی پورنیا مسکرائی تھی۔"

فوٹوگرافر نے ایک دیوار کے سہارے قطار میں بچوں کو کھڑا کر دیا تھا۔ چھوٹے بچے بچیوں کو زمین پر بٹھا دیا تھا۔ نیلے، ہرے، سرخ اودے، دھاری دار، چیک دار اور گل بوٹے والے کپڑے پہنے بچے مطمئن اور پر جوش نظر آرہے تھے۔ آرادھنا نے اٹھ کر فوٹوگرافر کو کچھ بتایا۔ فوٹوگرافر نے مسکرا کر سر ہلایا۔ پاس آکر بولی "میں کہہ رہی تھی فوٹوگرافر سے کہ کلک سے پہلے 'اسمائل' بول دے۔ میں نے رات اور صبح کو بچوں کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔"

"یس ریڈی"...... فوٹوگرافر نے کیمرہ آنکھ سے لگا کر فوکس برابر کیا۔

"اسمائل ...... مسکراؤ۔"

سارے بچے مسکرا دیئے۔

کلک۔ روشنی کا جھماکا۔ "تھینک یو۔"

"ایک سیکنڈ رکو۔ پھر اسمائل۔ یس۔ ریڈی"۔ کلک۔ روشنی کا جھماکا۔ "تھینک یو"

اسی وقت ٹائی والا ڈرائیور سے بات کر کے دروازے میں داخل ہوا تھا۔ یہ سب دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ تیز آواز میں کچھ بولا۔ اس کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ ٹھیک سے بول ہی نہیں پا رہا تھا۔ اس کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی

تھیں۔

اس نے بچوں کو وہیں کھڑا رہنے کا اشارہ کیا اور فوٹوگرافر کو الگ لے جا کر ڈانٹنے لگا۔

"فوٹوگرافر کا ہاتھ ہل گیا ہو گا۔" میں نے آرادھنا سے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔ نیا فوٹوگرافر لگتا ہے" آرادھنا بولی

فوٹوگرافر سر جھکائے جھکائے ٹائی والے کی ڈانٹ سنتا رہا۔

اس نے پھر آ کر کیمرہ فوکس کیا۔ "ریڈی" وہ چلایا۔

اب ٹائی والا ان بچوں کی طرف بڑھا اور بولا۔

"ایک تو نہا دھو کر کنگھی کر کے آئے ہو اوپر سے فوٹو کھنچواتے وقت مسکراتے بھی ہو۔ کون تمہیں اناتھ سمجھے گا۔ کون تمہارے لئے پیسے بھیجے گا۔ کس کو وشواس ہو گا کہ تمہارے ماں باپ مر چکے ہیں؟"

اس نے آگے بڑھ کر بچوں کے سنوارے ہوئے بالوں کو بکھیر دیا اور فوٹوگرافر نے جیسے ہی "ریڈی" کہا۔ ٹائی والا زور سے غرایا۔

"خبردار جو کوئی بھی مسکرایا۔ چپ چاپ بیٹھے رہو۔ مسکرانا مت۔"

"یس" فوٹوگرافر چلایا۔ سارے بچے اجڑے بالوں کے ساتھ سہمے سہمے بیٹھے رہے۔

کلک .... پھر کلک .... پھر کلک

"تھینک یو۔" فوٹوگرافر نے عادتاً کہا۔ وہ پسینے سے نہا گیا تھا۔

اچانک بچوں میں سے پورنیا دوڑتی ہوئی نکلی اور خاموش کھڑی آرادھنا کا ہاتھ پکڑ کر بے چینی کے ساتھ کچھ بولنا چاہا۔

"آنٹی! ... ہمیں اب مسکرانا ہے... کہ چپ رہنا ہے۔"

اس کی ہلکی بھوری آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ اس نے کچھ اور بولنا چاہا لیکن آواز اس کی حلق میں پھنس گئی۔ میں نے دیکھا اس کی ہلکی بھوری آنکھیں حیرت سے پھٹی کہ پھٹی رہ گئیں تھیں۔ باقی بچے منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے کبھی آرادھنا کو دیکھ رہے تھے کبھی مجھے، کبھی ٹائی والے کو، کبھی فوٹوگرافر کو۔

میں نے آرادھنا کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس نے میری نظروں سے آنکھیں چرا لیں اور نیچے سر جھکا لیا تو وہاں اسے ایک بچی کی سوال کرتی پھٹی پھٹی آنکھیں نظر آئیں۔ اس سوال کی

شدت سے بچنے کے لئے آرادھنا نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ دھیرے سے پورنیا کی آنکھوں پہ رکھ دیا۔
اسی وقت ہوا اچانک تھمی تھی۔ چند لمحوں کا یہ وقفہ خاموشی کا تھا مگر ایسی خاموشی جس میں تیز سیٹیاں بجتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ میں نے آرادھنا کی مایوس آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے مجھے دیکھا۔ ایک گہرا اور اجنبی سناٹا سارے میں پھیل گیا تھا اور اسی وقت، بالکل اسی وقت ہم دونوں نے شاید ایک ساتھ ایک ایسی آواز سنی جیسے بے شمار وحشی درندے اپنے اپنے سہمے ہوئے شکاروں پر آہستہ آہستہ داؤ لگا کر اچانک غرا کر ٹوٹ پڑے ہوں۔

OO

اندھا اونٹ

(محمد عمر میمن کے نام)

بورخیس پر محمد عمر میمن کے کام سے اہل نظر واقف ہیں۔ اس کہانی کا مرکزی خیال بورخیس کی کہانی کے ایک منظر سے مستعار ہے۔

سامان رکھ کر میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ اس سے ملنا ضروری ہے۔ میں خاموشی کے ساتھ گھر سے باہر آگیا۔ باہر پوس کی رات تھی اور کہرا اور قصبوں والی خاموشی۔

وہ کل صبح واپس چلا جائے گا۔ ابھی نہیں ملا تو مدتوں انتظار کرنا پڑے گا۔ آج میں اس سے چوبیس برس بعد ملوں گا۔ آج وہ کیوں آیا ہے۔ وہ تو آٹھواں پاس کرتے ہی اپنی ماں، بڑے بھائی اور بہن کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ قصبہ چھوڑ کر احمد آباد چلا گیا تھا جہاں کشتی رانی سکھانے کے ایک ادارے میں اسے تار کھولنے اور باندھنے کی معمولی ملازمت مل گئی تھی۔

چوک پار کر کے پھاٹک کی کھڑکی سے نکل کر میں نے محسوس کیا کہ قصبے کی گلیوں میں

اس وقت سناٹا اور اندھیرا اور خوف تینوں ہوں گے۔ تیز ہوا میرے رخساروں کو چھیلتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے مفلر دوہرا کر کے چہرا باندھ لیا۔

وہ مجھے اکثر خط لکھتا رہا۔ میں اپنی مصروفیت میں مشغول۔ سال چھے مہینے میں اس کا خط آہی جاتا تھا۔ ایک آدھ بار میں نے جواب بھی دیا۔ میں خط کا پابندی سے جواب نہیں دیتا تھا مگر اس کا خط نہ آئے تو دل میں ایک بے چینی سی رہتی تھی کہ کیا وہ میری ساری باتیں بھول گیا۔

"اکرم تمہاری رائٹنگ بہت اچھی ہے۔" وہ ڈیسک پر جھک کر میری کاپی پڑھ کر کہتا تھا۔

"اکرم تم والی بال بہت اچھا کھیلتے ہو۔ وہ گراؤنڈ پر لگے والی بال کے پوسٹ کو پکڑ کر گھنٹوں میرا کھیل دیکھتا تھا۔ جب میں ایر رائفل سے کوئی پرندہ گراتا تو مجھ سے زیادہ خوشی اسے ہوتی تھی۔

وہ میری ہر بات غور سے دیکھتا تھا۔ ہر بات پر پسندیدگی کا اظہار کرتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا وہ مجھے بے وقوف بنا رہا ہے کیونکہ میں اسے روزانہ ہاف ٹائم میں آدھی ٹافیاں دے دیا کرتا تھا۔ ایک دن کسی بات پر تکرار ہوگئی تو میں نے یہ بات جتادی۔ وہ بہت مغموم ہوا۔ اس کا سانولا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کی آواز رندھ گئی۔ وہ مجھ سے بات کئے بنا اسکول سے بستہ اٹھا کر اپنے گھر چلا گیا۔ شام تک جب کسی نے کسی بات کی میری تعریف نہیں کی تو مجھے بے کلی سی ہونے لگی۔ میں بھی بستہ اٹھا کر اسکول سے باہر نکل آیا۔ پھر انجانے میں ہی اس کے چھوٹے سے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کی امی دروازے پر آئیں، مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔

"آج یوسف سے لڑائی ہوئی ہے۔ دوپہر سے منہ پھلائے لیٹا ہے۔"

میں ان سے کچھ نہیں بولا۔ اندر جا کر اشارے سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ انہوں نے اندر والی کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بھی سردیوں کا زمانہ تھا۔ وہ ایک موٹا سا پھٹا ہوا لحاف اوڑھے منہ ڈھانپے لیٹا تھا۔ لحاف میں جہاں اس کا چہرہ تھا وہاں کچھ لرزش تھی۔ اسے میری موجودگی کا احساس ہے یہ سوچ کر میں پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ کلبلایا۔ میں نے اندر ہاتھ ڈال کر اس کے چہرے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرے ہاتھ کے نیچے اس کی گرم گرم بھیگی ہوئی آنکھیں پھڑک رہی تھیں۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ہم دونوں تھوڑی دیر تک ایسے ہی بیٹھے رہے۔ اس نے کوئی شکایت نہیں کی۔ میں نے بھی تفصیل نہیں پوچھی۔ پھر جب شام کو ہم دونوں والی بال گراؤنڈ پر ملے تو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

ہم دونوں پڑھائی میں اچھے تھے۔ وہ مجھ سے زیادہ اچھا تھا۔ آٹھویں میں اس کی فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن آئی۔ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں ننھیال چلا جاتا تھا۔ وہاں جا کر میں اپنا گھر، اسکول سب کچھ بھول جاتا تھا۔ وہاں حکیم جی خالو کے گھر میں پچڑ اپچڑا کر میٹھی یونانی دوائیں کھاتا تھا۔ بڑی خالہ کے گھر میں امرود پر دوپہر سے شام تک لٹکا رہتا تھا۔ شام کو اپنے ہم عمر خالہ زادوں کے ساتھ سراین ندی پر بنے ریلوے پل پر جانے کے لئے ریل کی پٹری پر پیدل مارچ کرتا تھا اس شرط کے ساتھ کہ اسٹیشن سے ندی کے پل تک پٹری پر چل کر دکھاؤں گا۔ کبھی کبھی اس کوشش میں ریلوے لائن کے کنکروں پر گر کر خونا خون بھی ہو جاتا تھا۔ رات کو ایک پڑوسی کے گھر جا کر اس کی بیٹی کے پاس بیٹھا دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی شربتی آنکھیں قدرتی طور پر ایسی ہیں یا وہ کچھ لگاتی ہے۔ پھر رات کو کسی بھی خالہ کے گھر سو جاتا تھا۔ وہاں میں زیادہ تر بھائیوں سے چھوٹا تھا۔ سب میری کچی پونی سمجھتے تھے اور خود کو سب سے بڑا عقلمند جانتے تھے۔ میں کوئی بھی کام کیوں نہ کر لوں کوئی تعریف ہی نہیں کرتا تھا۔ سب وہ کام مجھ سے بہتر کر لیتے تھے۔ ایک دن بگیا کی چار گز اونچی دیوار سے دھم سے کودا۔ گھٹنے کی ہڈی کھٹ سے بولی مگر ٹوٹی نہیں۔ میں سمجھا باقی بھائی حیرت سے منہ کھولے میری طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ جب دھول چھٹی تو دیکھا سب ہنس رہے ہیں۔ احتشام بھائی بولے۔

"ذرا سی اونچائی سے کودے اور ابھی تک اٹھ بھی نہیں پائے۔ ہم تو ایک دن ریلوے پل سے سراین ندی میں کود پڑے تھے جھم سے....."

چوٹ کی شدت اور مایوسی نے میرے دماغ کے اندر گیلا گیلا پانی چھوڑ دیا جو آنکھوں تک آیا مگر باہر نہیں نکلا۔

کاش اس وقت یوسف ہوتا۔ جب چھٹیاں گزار کر گھر آیا تو معلوم ہوا کہ یوسف کا بڑا بھائی اپنا گھر بیچ کر سب کو لے کر اپنے کسی خالو کے پاس احمد آباد چلا گیا ہے۔

"وہ لوگ اب کبھی نہیں آئیں گے۔" کسی نے بتایا۔

اس دن میں نے رات گئے تک اس کے گھر کے کئی چکر لگائے۔ وہ مکان کسی کبڑیے کو بیچ گئے تھے۔ میں نے مکان اندر سے دیکھنا چاہا تو انہوں نے دکھا دیا۔ مکان کا نقشہ بدل گیا تھا۔ جس کوٹھری میں اس کی پھڑکتی ہوئی آنکھوں پر میں نے ہاتھ رکھا تھا اس میں بھینس کا بھوسہ بھرا ہوا تھا۔ میں اس کے گھر سے نکل کر برابر کے کھنڈر میں آ کر بیٹھ گیا۔ یہاں ہم لوگ بیٹھ کر اگلی

زندگی کے منصوبے بناتے تھے۔ میں کمشنر بننا چاہتا تھا۔ میں نے کمشنر دیکھا نہیں تھا لیکن امی نے دیکھا تھا اور وہ یہی دعا کرتی تھیں۔ یوسف ایسے موقع پر کچھ کہتے کہتے رک جاتا تھا۔ وہ عہدہ تو نہیں بتاتا تھا مگر اس کی الجھی الجھی باتوں سے اتنا اندازہ ہوتا تھا کہ بڑے ہو کر اس کے پاس ایک بڑا گھر ہو اور ایک موٹر سائیکل۔ گھر اتنا بڑا ہو کہ اس میں تین کمرے ہوں۔ ایک میں امی ایک میں بڑے بھائی اور ایک میں وہ خود۔ اس رات میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ سناٹے اور اندھیرے کے باوجود کوئی خوف نہیں ہے۔ گھر میں میری تلاش شروع ہو چکی تھی۔ میر صاحب اور انعام اللہ ممالالٹین اور لٹھیا لئے ہوئے قصبے کا چکر لگاتے ہوئے میرے سامنے سے نکل گئے تھے۔ وہ پریشان لہجے میں میرے کھونے کا ذکر کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے میاں ناراض بھی ہیں اور پریشان بھی۔

جب وہ تیسری مرتبہ میرے سامنے سے نکلے تو میں نے انہیں آواز دی۔

"ارے اکرم میاں آپ یہاں کھنڈر میں کیا کر رہے ہیں اور کون لوگ ہیں؟"

"میں اکیلا ہوں۔"

"گھر چلئے میاں ناراض ہیں۔"

"کیا ڈنڈا لیئے ہیں؟"

"نہیں اس کی فکر مت کیجئے ہم کہہ دیں گے آپ درگاہ شریف کے پاس کھڑے تھے۔ مگر آپ یہاں رات کو کیا کر رہے ہیں؟"

"میں اپنے دوست یوسف کو یاد کر رہا تھا جو قصبہ چھوڑ کر احمد آباد چلا گیا ہے۔"

"چلئے ہم ان کو اگلے مہینے کچھ دن کو بلالیں گے۔ ان کی یہاں گذر بسر نہیں ہوتی تھی۔ بڑے بھائی کو ایک ملازمت مل گئی اس لئے وہ لوگ چلے گئے۔ اب آپ گھر چلیں۔"

پہلے میر صاحب نے گھر کے اندر والے دروازے پر جا کر میاں صاحب سے بات کی۔ انعام اللہ اس درمیان مجھے سمجھاتے رہے۔ گھر میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوا تو لالٹین کی روشنی میں صاف نظر آیا کہ میاں تیز تیز غصیلی نظروں سے گھور رہے ہیں۔ امی نے جلدی سے اپنے پاس بلا کر کھانا کھلایا۔ میاں "اونہہ" کہہ کر کروٹ بدل کر آیت الکرسی کی دستک دے کر سو گئے۔ میں امی کے پلنگ کے پاس والے پلنگ پر لیٹا رات بھر جاگتا رہا۔

دوسرے دن اسکول میں کوئی میری ڈیسک پر نہیں جھکا، شام کو والی بال کے پوسٹ سے

لگ کر کسی نے میرا کھیل نہیں دیکھا۔

مجھے لگا جیسے کہیں کچھ کم ہو گیا ہے۔ یوسف کے علاوہ بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا چیز کھوئی ہے۔ پھر لڑکپن ختم ہوا جوانی آئی اور تعلیم کے لئے دوسرے شہروں میں جانا پڑا۔ ملازمت ملی، عمر بڑھتی رہی۔

کمشنر تو نہیں ہیڈ کلرک تک پہنچنے میں ہی کتنے برس لگ گئے۔ بدن کی اشرفیاں گر گر کے کھوتی رہیں۔

ایک دن بیماری کی تعطیل ختم کر کے آفس پہنچا تو معلوم ہوا کہ میری جگہ کسی اور کا تبادلہ کر کے مجھے شماریات والے ناقص شعبے میں بھیج دیا گیا ہے۔

طبیعت کی خرابی کا خمار ابھی ذہن میں تھا اور پھر یہ اچانک افتاد۔ میں سیدھا کمشنر کے پاس پہنچ گیا۔

"ایک تو آپ نے اس مصروفیت کے زمانے میں چھٹی منائی۔ دوسرے آپ کی رائٹنگ بہت خراب ہے۔ ڈرافٹ سمجھ میں نہیں آتے۔" مجھے چکر سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے کرسی کا سہارا لے کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کی۔

"جناب میری رائٹنگ کی تو اسکول کے زمانے سے تعریف ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہو گی۔" وہ نرمی سے مسکرائے "مگر اب بہت خراب ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آیا۔ پچھلے ہفتے تک اسی رائٹنگ کے ڈرافٹ پڑھ پڑھ کر تو وہ احکامات پر دستخط کرتے تھے۔

"آپ ایک بار پھر سوچ لیں سر۔" میں نے کہا

وہ ناراض ہو گئے لیکن انہوں نے ضبط کیا اور کہا۔

"آپ اب جا سکتے ہیں۔"

"مجھے ذلت کا شدید احساس ہوا۔ مجھے پھر چکر آنے لگے۔

"آپ کا خیال ہے کہ میں والی بال بھی اچھی نہیں کھیل سکتا۔" وہ کچھ سمجھ نہیں پائے۔ میری طرف بھونچکا سے دیکھتے رہے۔

میں بھی کچھ نہیں سمجھ پایا۔ میں لمبی چھٹی کی درخواست ان کے آفس میں داخل کر کے اسی رات ٹرین میں بیٹھ کر دوسرے دن شام کو گھر آ گیا۔

میاں نے کہا" تمہارا بچپن کا دوست یوسف آیا ہوا ہے۔ تمہیں پوچھنے آیا تھا صبح چلا جائے گا۔ تبھی میں نے ارادہ کیا کہ صبح ہونے سے پہلے ہی اس سے مل لوں گا۔

اب اس کی گلی کا موڑ آگیا تھا۔ ماہوٹ کے بادل ہٹے اور چاند نے چہرہ دکھایا۔ شکر ہے کچھ روشنی تو ہوئی۔ اس کے پرانے گھر سے ہی اس کی رہائش کا سراغ لگے گا۔ اس کے گھر کے پاس پہنچ کر میں نے دیکھا کہ برابر والے کھنڈر میں کوئی شخص میری طرف پیٹھ کئے بیٹھا زمین کھود رہا ہے۔ چاندنی میں صاف نظر آیا کہ وہ کئی جگہ زمین کھود چکا ہے۔ برابر میں تازہ تازہ مٹی کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں۔

یہ کون ہے؟ کیا رات کو اس کھنڈر میں گڑھے کھود کر امرود کے پیڑ لگا رہا ہے؟ کھنڈر کے پار سنسان کھیتوں میں کوئی گیدڑ چلایا۔ میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ مجھے لگا جیسے وہ کوئی بھوت ہے جو اس سنسان رات میں کھنڈر میں گڑھے کھود کھود کر لوگوں کے کاٹے ہوئے سر دفن کر رہا ہے۔ میں نے آیۃ الکرسی پڑھنا چاہی تو معلوم ہوا کہ میں بھول گیا ہوں۔ میرے قدموں کی آہٹ پر اس نے اپنا چہرہ موڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کھرپا تھا جس سے وہ زمین کھود رہا تھا۔ چاندنی اس کے چہرے پر جھلملائی۔ اس کا سانولا چہرہ اور سنولا گیا تھا اور اس شدید سردی میں بھی اس کے چہرے پر پسینہ تھا۔ وہ کچھ دیر تک ویسے ہی بیٹھا رہا اور پھر تیزی سے اٹھا اور مجھے لپٹا لیا۔ کیوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لڑکپن اور جوانی سے ناواقف تھے اس لئے ہم دونوں کو ایک دوسرے کا بدن پہلے ہی جیسا اپنا سا لگا۔

ہم دونوں چاندنی کے نیچے کھنڈر میں دو پتھروں پر بیٹھ گئے۔

"یہ کیا کر رہے تھے؟" وہ چپ رہا۔ پھر دیر کے بعد بولا۔

"اپنی آٹھویں کی مارک شیٹ تلاش کر رہا تھا۔"

"کیوں؟ اب اس کی کیا ضرورت آن پڑی۔"

وہ دیر تک چپ رہا۔

"ایک دن بوٹنگ سیکھنے کے لئے ایک لڑکی آئی۔ وہ بہت بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ وہ اپنے ساتھی سے انگریزی میں کہہ رہی تھی کہ اسے بھگا دو ہم دونوں اکیلے بوٹ لے کر جھیل میں چلیں گے۔ میں نے ہندوستانی میں اس کو سمجھایا کہ یہ قاعدے کے خلاف ہو گا۔"

"وہ دونوں ناراض ہو گئے۔ ان کی ناراضگی کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ان کو جھیل میں

اکیلے جانے کے لئے روک رہا تھا بلکہ یہ تھا کہ میں نے ان کی انگریزی کیوں سمجھ لی۔"

انہوں نے غصے میں مجھے جاہل کہا تو میں نے نرمی سے سمجھایا کہ میں نے آٹھواں کلاس فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن سے پاس کیا تھا۔ اس پر وہ لوگ کھلکھلا کر ہنسے۔ انہیں اس بات کا یقین نہیں ہوا۔ وہ کہتے رہے کہ اگر آٹھویں میں اتنے اچھے نمبر تھے تو گریجویٹ ہونے سے کون روک سکتا تھا۔ گریجویٹ ہو جاتے تو بڑا آدمی ہونے سے کون روک سکتا تھا۔ انہوں نے چلتے چلتے یہ بھی جتایا کہ ناؤ چلانا سکھاتے ہو، بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہو گی اس لئے انگریزوں کے دو چار لفظ سمجھ کر خود کو قابل سمجھتے ہو۔ انہوں نے جاتے جاتے مجھے پھر جاہل کہا۔ میں گھر آکر نڈھال ہو کر بستر میں لیٹ گیا تو تمہاری بھابھی نے پورا احوال سننے کے بعد کہا کہ ایسے دل پر کوئی بات مت لیا کیجئے۔ میں انہیں کیا بتاتا کہ یہ مرض بچپن سے ہے۔"

یہ کہتے کہتے وہ مسکرانے لگا۔

اس کی مسکراہٹ کے پیچھے ہم دونوں کا مشترکہ ماضی تھا اس لئے میں نے دل میں خواہش کی کہ کاش وہ دیر تک مسکراتا رہے۔ مگر وہ ایک دم مغموم ہو گیا۔ میں نے اس سے آنکھیں نہیں ملائیں۔

میں نے کھنڈر پر ایک نگاہ ڈالی۔ پہلے سے بھی زیادہ شکستہ ہو گیا تھا۔ یہ کھنڈر کسی بڑے شہر میں ہوتا تو لوگ پلاٹ کر کے محل کھڑے کر لیتے۔ اس قصبے میں تو گاؤں والے بھی آکر نہیں بستے کہ گاؤں میں کم از کم اپنی زمینیں تو ہیں۔ یہ اور ایسے نہ جانے کتنے قصبے تقدیر کے بھاری قدموں کے نیچے آکر پامال ہو چکے ہیں، پامال ہو رہے ہیں۔

وہ بولا۔ "تمہاری بھابھی نے کہا تم اپنی مارک شیٹ ان دونوں کو لے جا کر دکھا دو۔ تو تمہارے دل کا غبار نکل جائے گا۔ تب مجھے یاد آیا کہ قصبے سے رخصت ہوتے وقت مارک شیٹ کو ایک ٹین کے ڈبے میں بند کر کے میں نے اس کھنڈر میں گاڑ دیا تھا۔ میں اس دلاسے پر گیا تھا کہ ایک آدھ برس بعد واپس آکر پھر پڑھائی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ مگر وہاں جا کر بھائی نے نہ تو آگے پڑھایا۔ کہاں سے پڑھاتے۔ خود ان کی ملازمت بہت معمولی تھی اور ہے۔ نہ مجھے کبھی یہاں آنے کا موقع ملا۔ سینکڑوں روپے کا کرایہ ہے لوٹا پھیری۔ مگر اس بار تمہاری بھابھی کی بات میرے دل کو لگ گئی۔ میں نے سوچا تم نہیں ملو گے تو کم از کم تمہارے گھر جا کر سب سے مل کر آؤں گا۔ میں میاں سے مل کر آیا۔ میاں کیسے ہو گئے ہیں۔ کمزور۔ سفید۔ جب میں گیا تھا تو وہ سیاہ

شیروانی پہنتے تھے اور قہقہہ لگاتے تو شیروانی کے بٹن ٹوٹ کر گر پڑتے تھے۔ ہم دونوں بین بین کر اٹھاتے تھے۔ کیا انہوں نے میرے آنے کے بارے میں بتایا تمہیں؟"

"ہاں۔ تبھی تو میں سیدھا چلا آرہا ہوں۔ تم وہاں کیا کرتے رہے اتنے دنوں؟"

"میں نے وہاں ادھر ادھر کی بہت سی کتابیں پڑھیں۔ کبھی کبھی میرا دل جب اوب جاتا تھا تو فلسفہ بھی پڑھتا تھا۔ تمہاری بھابھی مجھے فلسفی کہتی ہیں۔ ارسطو، افلاطون اور مسلم فلاسفہ میں ابن رشد اور غزالی کو پڑھا۔"

"ابن رشد کو مسلم کہتے ہو اس کے خیالات تو مشرکانہ تھے۔ امام غزالی کی کتابوں کا رد لکھتا رہتا تھا۔"

"دونوں کی سمجھ اپنے اپنے حساب سے کام کرتی تھی۔ وہ خدا کے تصور اور قدرت خداوندی کے بارے میں امام غزالی کے خیالات سے متفق نہیں تھا۔ صرف اتنی سی بات پر اسے مشرک کہنا زیادتی ہو گی۔"

اس رات کھنڈر میں بیٹھے مجھے یہ فلسفیانہ باتیں غیر ضروری لگیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے یوسف سے ایک سوال کیا۔ "یوسف تم کو میرا خط یاد ہے؟"

"تم بہت کم جواب دیتے تھے۔ کون سا والا خط۔"

"وہ خط نہیں.......... میرا مطلب رائٹنگ سے ہے؟"

"ہاں ہاں یاد ہے۔ کیوں؟"

میں ایک دم سے مایوس ہو گیا۔ کاش وہ اس وقت فوراً ہی کہہ دیتا کہ تمہاری رائٹنگ مجھے خوب یاد ہے۔ ہمارے ساتھیوں میں تم سے اچھی رائٹنگ کسی کی تھی ہی نہیں

ہم دونوں دیر تک چپ چاپ رہے۔ جیسے میں کسی شخص کو جانتا ہوں کہ وہ مجھے اس انداز سے چاہتا ہے اور وہ شخص نہیں جانتا کہ وہ مجھے اس انداز سے چاہتا ہے۔ یہ احساس پہلی بار ہوا۔ اور اس احساس میں بڑی تکلیف تھی۔

وہ پھر کھرپالے کر زمین کھودنے لگا۔ پھر اچانک رک کر بولا۔

"ابن رشد سے متعلق ایک کہانی پڑھ کر اکثر مجھے لگتا ہے کہ ایک اونٹ ہے۔ وہ اندھا ہے۔ اور وہ مجھے روندتا ہوا چلا جارہا ہے۔"

رات کیوں کہ رات ہوتی ہے اور رات میں خوف بھی ہوتا ہے تو مجھے خوف محسوس

ہوا۔ مجھے اونٹ کا پیکر خیال کر کے اور بھی ڈر لگا۔ مجھے اس کے اندھے پن کے خیال سے جھر جھری سی محسوس ہوئی۔ میں کھسک کر اس کے پاس ہو گیا۔

میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کا سانولا چہرہ بچپن کے اُس واقعے کی طرح سرخ ہو گیا تھا اور چاندنی میں اس پر پسینے کی بوندیں جھلملا رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک زنگ خوردہ ٹین کا ڈبہ تھا۔ زنگ اتنا جم گیا تھا کہ ڈبہ کھلنا دشوار تھا۔ اس نے کھرپے سے کاٹ کاٹ کر ڈبے سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ پھر اس کاغذ کو کھول کر اس کے اندر سے مارک شیٹ نکالی۔ چاندنی میں ہم دونوں نے واضح پڑھا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن۔ وہ کچھ اور بھی خوش ہوتا کہ اس وقت میرے دل میں ایک کمینہ خیال آیا اور میں نے اس کا اظہار کرنے میں دیر نہیں کی۔

"یہ مارک شیٹ مل گئی تو کیا ہوا۔ اسے اس لڑکی اور اس کے ساتھی کو دکھا بھی دو تو کیا ہوگا۔ کیا وہ تمہارا ماضی تمہیں واپس کر دیں گے کہ لو اب اس مارک شیٹ کے سہارے گریجویٹ بن جاؤ۔"

یہ کہہ کر مجھے محسوس ہوا کہ میرے دل پر سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

یوسف نے کچھ دیر تک مارک شیٹ کو ہاتھوں میں ویسے ہی سنبھالے رکھا پھر شدید مایوسی کے انداز میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ میرا جملہ سن کر اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ اب مجھے اپنا بچپن والا یوسف یاد آیا۔ مجھے اس سے اچانک ہمدردی محسوس ہوئی۔ میں نے تلافی کرنے والے انداز میں کہا۔

"گریجویٹ ہونے سے بھی کیا ہوتا ہے یوسف۔ دیکھو میں تمہارے سامنے ایک گریجویٹ بیٹھا ہوں۔ کل ہی میرا تبادلہ صرف اس بات پر کر دیا گیا کہ میری رائٹنگ خراب ہے۔"

رائٹنگ والی بات پر اب بھی اسے کچھ نہیں یاد آیا۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ "وہ اندھا اونٹ تمہیں بھی پامال کر گیا۔"

کھنڈر کے پار کھیتوں میں پھر کوئی گیدڑ رویا۔ ہم دونوں نے ادھر دیکھا۔ اور دیکھا کہ کھیتوں، باغوں، قصبوں، شہروں اور ملکوں اور انسانوں کو روندتا ہوا ایک اندھا اونٹ بھاگا چلا جا رہا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو گئے اور سر جھکائے دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔

OO

دعا

اس نے روٹی توے پر ڈال کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ رنگ برنگے کپڑے پہنے کالونی کے بچے لان میں کھیل رہے تھے۔

"بارش آنے والی ہے۔ کپڑے اٹھاؤ" میم صاحب نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا اور چلائیں۔

"کپڑے اٹھاؤ" اس نے دھیرے سے دہرایا۔

گیس کا چولہا بند کر کے آٹے میں سنے ہاتھوں کو تیزی سے دھوتا ہوا بالکنی میں گیا۔ کپڑے اٹھائے اور اسٹور روم میں بندھے لوہے کے پائپوں پر لٹکا دیئے۔ کپڑوں سے بوند بوند پانی ٹپکنے لگا۔ اب یہ جگہ صبح تک نہیں سوکھے گی۔ میں تھوڑا سا کھسک کر سو جاؤں گا۔ اس نے اندازہ

کیا کہ اگر رات بھر ایک کروٹ سے سویا جائے تو گیلی زمین سے بچا جا سکتا ہے۔ اچانک اسے توے کی روٹی کا خیال آیا۔ وہ جلدی سے کچن میں داخل ہوا۔ روٹیاں پکانے لگا۔ پھر کچھ خیال آیا۔ ہاتھ دوبارہ دھوئے۔ اسٹور روم میں جا کر فل اسپیڈ پر پنکھا چلایا اور واپس آ گیا۔ کچن کی کھڑکی سے ڈرائنگ روم کی گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ ایک بجنے والا ہے۔ بے بی بابا کی اسکول بس آنے والی ہے۔ آخری روٹی ڈبے میں رکھی۔ ڈھکنا بند کیا۔ ہاتھوں پر لگے آٹے کو مسلتا، دروازہ کھولتا، سیڑھیاں اترا اور بس اسٹینڈ کے پاس جا کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ بس آ گئی۔ اُمس اور گرمی سے بوکھلائے چہرے لئے دو ننھے ننھے بچے بستے لئے اترے۔ دونوں کی انگلی پکڑ کر فلیٹ تک آیا۔ بستے سے جھانکتی کورس کی رنگین کتابوں کو راستے بھر دیکھنے کی کوشش کی مگر بچے ایک سا کہاں چلتے ہیں۔ ایک سیدھا قدم ادھر، دوسرا ٹیڑھا قدم اُدھر۔ گھر میں داخل ہو کر بچوں نے کرسی پر بیٹھ کر جوتے آگے کر دیئے۔ اس نے جھک کر باری باری دونوں کے جوتے اتارے۔ پھر بے بی کے موزے اتارے۔ اتنے میں بابا اپنے موزے اتار کر ان سے فٹ بال کھیل چکے تھے۔ موزے بین کر لایا تو بابا اور بے بی جوتوں سے فٹ بال کھیلنے لگے تھے۔

"ان بچوں کو" میم صاحب قریب آتے ہوئے رسان سے بولیں "سکھاؤ۔ جوتے الماری میں رکھو۔ موزے دھونے کے لئے ڈال دو۔ ٹیبل پر بچوں کا کھانا لگانے سے پہلے فروٹ کاٹ کر رکھ دو"۔

"فروٹ کاٹ کر رکھ دو" اس نے منہ ہی منہ میں دہرایا "فروٹ کاٹتے وقت اس کا ہاتھ چھری سے کٹ گیا۔ لال لال خون۔ بابا اور بے بی پہلے تو خون دیکھ کر چونکے اور پھر ٹھٹھے لگائے مگر اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر ماما سے چھری کی شکایت کرنے چلے گئے۔

"تمہیں جب فروٹ کاٹنے کی بہت جلدی ہوتی ہے تبھی تم اپنا ہاتھ کاٹتے ہو۔ جاؤ پہلے ہاتھ اچھی طرح سے دھوؤ۔ ڈیٹول لگاؤ۔ تب آ کر کھانا لگانا۔ ڈیٹول کی بو کھانے میں نہ آئے۔ دھیان رکھنا"۔

"دھیان رکھنا" وہ اپنے آپ سے بولا۔

"ماما۔ آج ہم بارش میں نہائیں گے۔" دونوں نے ایک ساتھ ضد کی۔

"نہیں پہلے کھانا کھالو۔ پاپا ڈانٹیں گے آفس سے آ کر۔"

"پاپا کو مت بتانا۔ ہمیں سلیم لے جائے گا نیچے۔ پلیز ماما"

"آج بارش بہت زور کی ہے۔" میم صاحب نے جیسے خود سے کہا۔

"بچوں کو کھانا کھلا کر کچھ دیر کے لئے سلا دو۔ شام تک بارش ہوتی رہے تو نیچے لے جانا۔ بچے بارش میں نہانا چاہتے ہیں۔ رین کوٹ، پہنا کر لے جانا۔ میں بھی اب سوتی ہوں۔ فون کا ریسور اٹھا کر رکھ دینا۔"

"کیا آج میم صاحب خط لکھیں گی" اونگھتی ہوئی مالکن سے دو گھنٹے بعد دبی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"ہاں ہاں ضرور لکھوں گی۔" میم صاحب نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ اگر خط نہ لکھوں تو اس کے ماں باپ خیریت نہ پا کر بوکھلا کر اپنے وطن سے یہاں آجاتے ہیں۔ پندرہ سو روپیہ مدد ہزار روپے کرایہ۔ تنگ مکان میں دو دن مہمان داری کچھ جوڑے پرانے کپڑے...

"قبلہ جناب والد صاحب اور اماں صاحبہ۔ السلام علیکم"

"السلام علیکم میں 'ایس' سنگل ہے کہ ڈبل" میم صاحب نے صاحب سے پوچھا جو آفس سے آکر بیگ رکھ رہے تھے۔

"جیسا سلام ہو۔ بہت محبت بھرا ہو تو ڈبل ایس ورنہ سنگل ایس سے کام چل جائے گا۔"

میم صاحب نے لگاوٹ سے منہ بنا کر صاحب کی بات سنی اور خط لکھنا شروع کیا۔ صاحب باتھ روم میں جا چکے تھے۔

"میں یہاں پر بالکل خیریت سے ہوں اور خداوند کریم سے آپ سب کی خیریت نیک چاہتا ہوں آپ دونوں کی بہت یاد آتی ہے"..................

میم صاحب نے اس کی طرف بغیر کسی غصے کے دیکھا۔" اس سے وہ سمجھیں گی کہ تم بہت پریشان ہو۔ وہ بھی پریشان ہو جائیں گے اور پھر.................. اسے یوں لکھ دیں کہ امید ہے آپ دونوں مجھے یاد کرتے ہوں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"جی ہاں.................. اور بہت دنوں سے آپ کو دیکھا نہیں تو.................."

"اسے یوں لکھواؤ کہ ابھی حال میں جب آپ دونوں آئے تھے تو آپ کو دیکھ کر بہت دل خوش ہوا تھا.................. ایسی بات لکھواؤ جن سے ان کا دل خوش ہو۔"

"جی.................. اور یہاں آج کل بارش ہو رہی ہے۔ گاؤں میں تو ابھی گرمی ہو گی۔ گرم ہوا بھی ہو گی۔ یاسمین کو دوپہر میں پڑوس کے برتن مانجھنے مت بھیجئے گا۔ منو کو دھوپ میں

مت جانے دیجئے گا۔ پچھلی بار وہ املی کے پیڑ سے..........

"دونوں بچوں کا خیال رکھئے گا۔ میں یہاں سے ہر مہینے تنخواہ بھیجتا ہوں تو چھوٹے بھائی بہنوں کو برتن مانجھنے کی کیا ضرورت ہے ایسا لکھ دیا ہے۔" میم صاحب کی نظریں خط پر تھیں۔

"جی ہاں.......... میں فجر کی نماز پڑھتا ہوں اور عشاء کی نماز جیسا کہ داوا نے بتایا تھا خوب رات گئے پڑھتا ہوں.........."

"میں پانچوں وقت کی نماز پابندی سے پڑھتا ہوں۔ ایسا لکھ دیا ہے۔ وہ والے ٹائمنگ لکھواؤ گے تو سوچیں گے کہ صبح ۵ بجے سے رات ۱۲ ار بجے تک تم کام کرتے ہو۔ اس کی اطلاع دینے کی کیا ضرورت ہے۔"؟

"جی ہاں! کھانے کے بارے میں آپ نے پوچھا تھا تو.........."

"کھانا میں تین ٹائم کھاتا ہوں۔ صبح ناشتہ کرتا ہوں، دوپہر کو لنچ اور رات کو ڈنر۔ ایسا لکھ دیا ہے۔ بابا بے بی کا بچا ہوا کھانا وہی کھانا تو ہوتا ہے جو ہم کھاتے ہیں ہم لوگ ان کے اور تمہارے کھانے میں کوئی فرق نہیں کرتے ہیں۔"

"جی ہاں! منو تو اب خوب بڑا ہو گیا ہو گا۔ اسکول جاتا ہو گا۔ اس کے پاس رنگین کتابیں ہیں یا نہیں۔ یاسمین مدرسے میں مولوی صاحب سے پڑھنے جاتی ہے کہ نہیں۔"

"امید ہے کہ دونوں بھائی بہن دل لگا کر پڑھتے ہوں گے۔ ایسا لکھ دیا ہے۔ سیدھے سیدھے انداز میں لکھوایا کرو۔ گاؤں میں رنگین کتابیں کہاں سے آئیں گی۔ سوچ سمجھ کر لکھاؤ۔"

"جی ہاں میم صاحب اور صاحب میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ہر دم ان کی زبان پر میرا نام رہتا ہے۔"

صاحب اور میم صاحب مجھے اپنے بچوں کی طرح چاہتے ہیں وہی کھلاتے پلاتے ہیں جو اپنے بچوں کو۔ ایسا لکھ دیا ہے۔ ہر دم ہماری زبان پر تمہارا نام رہتا ہے۔ اس کا مطلب ہے ہم تم کو ہر دم کام کے لئے حکم دیتے رہتے ہیں۔ تمہیں بالکل عقل نہیں ہے۔"

"جی ہاں! آج یہاں بہت تیز بارش ہے.........."

یہ تم پہلے ہی لکھا چکے ہو۔ کچھ اور لکھانا ہے۔؟

"جی ہاں۔ منو سے کہئے گا میں اس کے لئے رنگین کتابیں اور یاسمین کے لئے جوتے موزے لے کر آؤں گا۔"

"یہ سب لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم لوگ پارسل سے بھیج دیں گے۔ پچھلی بار نہیں بھیجے تھے کیا جب بابا بے بی کے چھوٹے ہو گئے تھے۔"

"جی ہاں"

"اور کچھ لکھواؤ گے؟ جلدی کرو۔"

"جی ہاں۔ دادا کی مزار پر سلام اور فاتحہ، دادی کو سلام، مسجد کے امام صاحب کو سلام اور مؤذن صاحب سے کہنا کہ میں ان کے لئے حج والا رومال لے کر آؤں گا۔ نہیں۔ پارسل سے بھیج دوں گا۔"

"شاباش۔ یہ ویسا کا ویسا لکھ دیا ہے۔ اور کچھ؟" میم صاحب اب تھک گئی تھیں۔

"جی ہاں۔ فقط آپ کا تابعدار بیٹا محمد سلیم صدیقی۔"

"ہاں۔ ہاں۔ یہ بھی لکھ دوں گی۔" باتھ روم سے صاحب باہر آ گئے ہیں۔ جلدی سے چائے بناؤ۔ دو پیالی بنانا۔ ہوا بہت سرد ہو گئی ہے۔ ٹیبل پر لگانا۔"

چائے لے کر جب وہ ٹیبل پر پہنچا تو دونوں بیٹھے ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔

"دیکھ رہے ہیں آپ۔ ٹی وی پر سلائڈ آ رہی ہے۔ آج عرب ساگر میں ہوا کا دباؤ کم ہونے کے کارن طوفان آسکتا ہے یہ طوفان بیچ رات میں آئیگا۔"

"ارے" صاحب نے سر اٹھا کر ٹی وی اسکرین پر دیکھا۔

"دیکھو آج بابا لوگوں کو نیچے کھلانے مت لے جانا۔ طوفان کا کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں کا طوفان بہت سخت ہو جاتا ہے۔ آج سے پانچ سال پہلے اتنا زبردست طوفان آیا تھا کہ گھر کی ساری کھڑکیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ پورے گھر میں جل تھل ہو گیا تھا۔ جانے کتنی بلڈنگیں گری تھیں۔ معلوم نہیں کتنے آدمی مارے گئے تھے۔ بہت تباہی مچی تھی۔ سونے کے لئے کوئی سوکھی جگہ نہیں بچی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل الٹ گئی تھی۔ گیس کا چولہا پلٹ گیا تھا۔ پھر بعد میں کاکروچوں اور مچھروں سے مہینے بھر ہم لوگ لڑتے رہے تھے۔ پورے گھر کا روٹین مہینے بھر ڈسٹرب رہا تھا۔"

"ڈسٹرب رہا تھا" وہ خود سے بولا۔

بابا بے بی کا شام کا اوولٹین ملے دودھ کا گلاس لے کر جب وہ ان کے پاس کمرے کی طرف جا رہا تھا تو اسے خیال آیا کہ آج اسے اس گھر میں چار سال ہو گئے ہیں۔ "چار سال ہو گئے" وہ دھیمے سے بڑبڑایا۔

بابا بے بی نے جگانے پر اسے خوب جھنجھوڑا۔ اس کے ہاتھ سے دودھ کے گلاس چھوٹتے چھوٹتے بچے۔ بڑی مشکل سے منا پایا۔ وہ دونوں کو چار سال پرانی کہانی سنانے لگا۔ "ایک بھالو تھا اور ایک بندر تھا.........."

اسے کوئی کام کرتے وقت سوچنا نہیں پڑتا تھا۔ گھر کا روٹین کس طرح چلانا چاہئے وہ ان چار برسوں میں جان چکا تھا۔ الارم کی آواز پر اٹھنا، وضو کر کے نماز پڑھنا، رات کے دھوئے کپڑے جو سوکھ چکے ہوتے تھے، اتار کر تہہ کر کے استری والے کمرے میں لا کر استری کرنا، استری کر کے دو پیالی چائے بنا کر صاحب میم صاحب کے کمرے پر تین بار دستک دینا۔ وہیں ٹیبل پر چائے رکھ کر بچوں کو اٹھانا، انہیں اسکول کے لئے تیار کرنا، اور پھر دن بھر اسی طرح کے کام.......... بغیر کسی فرق بغیر کسی رکاوٹ کے مسلسل، مستقل.......... دوپہر کو بابا بے بی کے آنے سے پہلے کھانا..........

"ادھر آؤ" میم صاحب نے آواز دی

وہ بچوں کے پاس سے خالی گلاس اٹھا لایا۔

"تم اس دن بچوں کو اپنے دادا کی بتائی ہوئی باتیں سنا رہے تھے۔؟

"اب نہیں سناؤں گا۔ اس دن غلطی ہو گئی تھی کہ ان کے ہوم ورک کے ٹائم میں ان کو وہ باتیں بتانا پڑیں۔ اصل میں وہ ہوم ورک نہیں کر پا رہے تھے اس لئے بہلانے پھسلانے کے لئے کہانی کی طرح دادا کی باتیں سنا رہا تھا۔"

"نہیں۔ تم بتاؤ کہ اس میں شاید تم نے طوفان اور بارش اور بجلی سے بچنے کی کسی دعا کا ذکر کیا تھا۔ ذرا ٹھیک سے یاد کر کے بتاؤ۔"

سلیم نے کھڑکی کے باہر ہوا کا اڑتا اور سمندر کا شور سنا اور سمجھ گیا۔ وہ تفصیل سے بتانے لگا۔ اس بار اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

"رات کو جب طوفان آتا ہوا لگے۔ آسمان پر بجلی کڑکے، بارش بہت تیز ہو تو سب سے پہلے وضو کر کے عشاء کی نماز پڑھ لیں پھر درود غوثیہ سات بار، پھر قل شریف ۵ بار، پھر الحمد شریف ۷ بار، پھر درود شریف ۷ بار۔ یہ سب پڑھ کر فاتحہ دیں کہ اس کا ثواب حضور غوث پاک کی روح کو ملے اور پھر کہیں کہ اے حضور غوث پاک آپ اللہ سے دعا فرمائیں کہ وہ اپنے حبیب ﷺ کے صدقے میں طوفان، بارش اور بجلی سے ہم سب کو محفوظ رکھے۔ آمین ثم آمین"

ٹھیک ہے۔ تم عشاء کے بعد یہ پورا وظیفہ ختم کرنا اور دعا مانگنا کہ طوفان ٹل جائے۔ سمجھے؟"

"جی اچھا"

میم صاحب نے صاحب کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔

باہر کوئی درخت ٹوٹ کر گرا۔ میم صاحب اچھل کر کھڑی ہو گئیں۔ صاحب بھی کھڑے ہو گئے۔ وہ کھڑکی کی طرف بڑھے۔

"کھڑکی مت کھولیے گا۔ بجلی چمک رہی ہے۔ پانی بھی آسکتا ہے۔ بہت تیز بوچھار ہے۔" میاں بیوی نے محسوس کیا کہ کھڑکیوں کے باہر عمارتوں سے پرے، سڑک کے اُدھر دور دور تک پھیلے طوفانی سمندر میں لہروں کا شور اتنا تیز ہے کہ کھڑکیاں کھول دیں تو بادل کی طرح گرجتا ہوا سمندر کمرے کے اندر گھس آئے گا۔ میم صاحب نے جھرجھری سی لی۔

طوفان آجائے تو ہر چیز الٹ پلٹ ہو جاتی ہے۔ سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔" وہ بڑبڑائیں۔

"درہم برہم" اس نے روز کی طرح گلاس سنک میں رکھے اور یہ جملہ دہرایا۔ "درہم برہم۔ درہم برہم"

"چلو تم نماز کی تیاری کرو۔ تمہیں وظیفہ بھی پڑھنا ہے۔ ہم دونوں دیکھیں گے کہ تم کچھ بھول نہ جاؤ۔" میم صاحب نے آواز دی۔

اس نے وضو کیا، میلی بوسیدہ دیہاتی جانماز اٹھائی، عشاء کے فرض اور وتر اور سنتیں ختم کیں اور بیٹھ کر وظیفہ پڑھنے لگا۔

باہر شور بہت تیز ہو گیا تھا۔ اس شور میں وقفے وقفے سے انسانی چیخ و پکار بھی شامل ہو جاتی تھی۔ تڑپ تڑپ کر بڑھتی ہوئی موجوں کی آواز بہت مہیب تھی۔

بجلی کے چمک دار لہریے کھڑکی کے پردوں کے اندر سے بھی واضح نظر رہے تھے۔ کسی بھی لمحے طوفان تیز ہو سکتا تھا۔ اچانک بجلی چلی گئی۔

"اوہ گاڈ اب کیا ہو گا۔" میم صاحب گھبرائیں۔

صاحب نے بڑی موم بتی جلا کر جانماز کے پاس رکھ دی۔ وہ ہل ہل کر بلند آواز میں وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ بند کمرے میں موم بتی کی زرد روشنی میں جانماز پر بیٹھے اس کے وجود کا لمبا چوڑا

سایہ سامنے دیوار پر ہل رہا تھا۔ اب اس نے فاتحے کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ فاتحہ ختم کیا۔ اچانک وہ رک گیا۔ یہ دعا کا وقت تھا۔ وہ دیر تک رکا رہا۔ اب وہ بالکل خاموش تھا۔ سامنے کی دیوار پر اس کے کمزور ہاتھوں کا ساکت عکس، بڑے بڑے ہیولوں کی شکل میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ دیر تک اٹھے رہے مگر ہونٹ مضبوطی سے بھنچے رہے۔

کن انکھیوں سے دونوں کو دیکھ کر اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور جانماز کا کونا الٹ دیا۔ باہر بہت زور سے بجلی کڑکی۔ تیز ہوا چلی۔ کئی درخت ایک ساتھ ٹوٹے اور بادل بہت زور سے گرجا۔

صاحب اور میم صاحب نے گھبرا کر پوچھا۔ "دعا پڑھ لی۔"؟

"ہاں" اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔ اور دل ہی دل میں خوب خوش ہوا کہ کسی کو خبر ہی نہیں ہو سکی کہ میں نے کیا کیا۔

"درہم برہم۔ درہم برہم" اس نے دل ہی دل میں دہرایا۔

"کیا دعا مانگی" وہ اس کے چہرے اور دیوار پر اس کے سایے کو گھور رہے تھے۔

"دادا نے منع کیا تھا۔ دعا کسی کو نہیں بتاتے ہیں۔" اس نے ویسے ہی سر جھکائے جھکائے جواب دیا اور کھڑکی کے باہر مسلسل بڑھتے ہوئے طوفان کی ہیبت ناک آوازوں کو سنتے ہوئے سلیقے کے ساتھ جانماز تہہ کرنے لگا۔

○○

بادِ صبا کا انتظار

(مرحوم محمود ایاز کے لئے)

ڈاکٹر آبادی میں داخل ہوا۔

راستے کے دونوں جانب اونچے کشادہ چبوتروں کا سلسلہ اس عمارت تک چلا گیا تھا جو لکھیا اینٹ کی تھی اور جس پر چونے سے قلعی کی گئی تھی۔ چبوتروں پر انواع واقسام کے سامان ایک ایسی ترتیب سے رکھے تھے کہ دیکھنے والوں کو معلوم کئے بغیر قیمت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ سامان فروخت کرنے والے مختلف رنگوں اور نسلوں کے نمائندے تھے جو اپنی اپنی دوکانوں پر چاق و چوبند بیٹھے تھے۔ چبوتروں کا یہ سلسلہ اس عمارت پر جا کر ختم نہیں ہوتا تھا بلکہ عمارت کے دوسرے رخ پر اسی طرح کے چبوترے انواع واقسام کے سامان کے ساتھ سجے ہوئے دور تک

چلے گئے تھے۔ راستے میں گٹھیلے بدن کے مرد، کندھے پر مشکیزے لٹکائے ہاتھوں میں کٹورا پکڑے، بجا رہے تھے اور چھڑکاؤ کرتے پھر رہے تھے۔ خریدار مختلف قبیلوں، گروہوں اور رنگوں کی پوشاک پہنے اس چبوترے سے اس چبوترے تک آجا رہے تھے۔ راستہ طرح طرح کی شیریں، نرم، سخت، کرخت، بھدی، چیختی ہوئی، دکھی سکھی آوازوں سے بھرا ہوا تھا۔

لکھیا اینٹ کی سفید عمارت کے دیواریں ناقابلِ عبور حد تک اونچی نہیں تھیں۔ ان میں جگہ جگہ در، دریچے اور روشندان تھے اور ان سے آتی ہوئی ھو، حق کی پراسرار گونج دار آوازیں بازار میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ بازار میں کھڑے ہو کر ان آوازوں کو سن کر ایسا لگتا تھا جیسے ان آوازوں کے جسم ہوں اور ان جسموں پر دراز سفید ریشم جیسی داڑھیاں ہوں اور کانوں سے نیچے تک کھیلتی ہوئی نرم نرم کاکلیں ہوں۔ ان آوازوں کو سن کر ایک ایسے سکون کا احساس ہوتا جو سخت لو میں، کوسوں کا سفر پاپیادہ طے کرنے کے بعد ٹھنڈی صراحی کا سوندھا سوندھا پانی سیر ہو کر پینے پر ملتا ہے۔ نیچی نیچی دیواروں والی اس نورانی عمارت کو چاروں طرف سے ستونوں، برجیوں، مناروں اور پھاٹکوں نے گھیر رکھا تھا جو بظاہر کسی محل کی موجودگی کا احساس دلاتے تھے۔ کسی نے شاید بہت کوشش کی بھی نہیں اور اگر کرتا بھی تو غالباً یہ جاننا بہت مشکل ہوتا کہ بازار اس سفید عمارت کو گھیرے ہوئے ہے یا بازار اس سفید عمارت کا باہری حصہ ہے یا یہ دونوں ستونوں اور مناروں والی عمارت کے ناقابلِ تقسیم حصے ہیں۔ یہ تینوں کسی واحد نقشے کی بنیادی لکیروں کی طرح ایک دوسرے سے متصل اور مسلسل تھے۔ محل نما عمارت کے اندر سے کبھی کبھی تیز آوازیں بلند ہوتیں جو سفید عمارت کے 'ہو حق' اور بازار کی چہکتی رنگارنگ آوازوں پر ایک لمحے کے لئے چھا جاتیں۔ کبھی کبھی یہ وقفے طویل بھی ہو جاتے۔ پھر اچانک یہ بھی ہوتا کہ بازاروں کی آوازیں دھیمی دھیمی سرگوشیوں کے لب و لہجہ میں بلند ہوتیں ان میں کھنکھناہٹ پیدا ہوتی بہت سی آوازیں مل جاتیں اور پھر سفید عمارت کی نورانی کا کل دار آوازیں بازار کی آوازوں کے ساتھ مل کر محل کی سب آوازوں کو ڈھانپ لیتیں۔

ڈاکٹر نے ہاتھ لگا کر جنیو برابر کیا، گلے میں پڑے آلے کو ٹٹول کر محسوس کیا اور ہاتھ میں تھامے بیگ کو مضبوطی سے پکڑے اس اونچے مستطیل کمرے میں داخل ہو گیا جو اس آبادی اور عمارتوں کے عین درمیان میں واقع تھا۔ ایک لمحہ کو ٹھٹھک کر اس نے کمرے کی سوگوار ٹھنڈی خاموشی بھری فضا سے خود کو ہم آہنگ کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس بے پناہ حسین کمرے کو دیکھ

کر سہم گیا ہو۔ کمرے کے درمیان مدوّر پایوں کی ایک بڑی اور حسین مسہری پڑی تھی جس کے سرہانے کے سیاہ حصے میں نفیس کام بنا ہوا تھا۔ مسہری پر قیمتی اور مرعوب کرنے والا بستر لگا ہوا تھا اور اس بستر پر وہ بدن رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک دراز قد نہایت حسین و جمیل خاتون تھی۔ اس کے بال ترکی نژاد عورتوں کی طرح سنہرے تھے جن سے عمر کی شہادت نہیں ملتی تھی۔ اس کی پیشانی شفاف اور ناک ستواں اور بلند تھی۔ آنکھیں نیم وا اور سرمگیں تھیں۔ ہونٹ اور رخسار بیماری کے باوجود گلابی تھے۔ ہونٹ بھی نیم وا تھے اور سفید موتی سے دانت ستاروں کی طرح سانس کے زیرو بم کے ساتھ ساتھ رہ رہ کر دمک رہے تھے۔ شفاف گردن پر نیلگوں مہین رگیں نظر آ رہی تھیں اور گردن کے نیچے کا عورت حصہ اٹھا ہوا اور مخروطی تھا۔ ساعد سیمیں کولہوں کے ابھار سے لگے ہوئے رکھے تھے۔ ڈاکٹر نے غور سے اس کے ہاتھوں پیروں کو دیکھا اور ایک عجیب بات محسوس کی کہ خاتون کے بھرے بھرے ہاتھ اور پیر محنت کے عادی ہونے کی غمازی کر رہے تھے لیکن انہیں نرم اور صاف ستھرا رکھنے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ مریضہ کی سانس بے ترتیب تھی۔ کئی کئی لمحوں تک بدن ساکت نظر آتا پھر یکایک جھٹکے کے ساتھ بے ترتیب سانسیں آنے لگتیں۔

مسہری سے ٹکا ہوا وہ دراز قد شخص استادہ تھا جس کے سر اور بالوں کو ایک گوشے دار کلاہ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ سرخ و سفید معمر چہرے پر خوبصورت داڑھی تھی جو باترتیب نہیں تھی۔ اس شخص کی آنکھوں میں جلال و جمال کی پرچھائیاں رہ رہ کر چمکتی تھیں۔ اپنی شخصیت اور لباس سے وہ کبھی بادشاہ لگتا کبھی درویش۔ ڈاکٹر مسہری کی دوسری طرف اس شخص کے مقابل سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

ڈاکٹر دیر تک مریضہ کو دیکھتا رہا۔ وہ شخص متفکر آنکھوں سے مریضہ کو ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ دفعتاً ڈاکٹر کو احساس ہوا کہ اس بڑے مستطیل کمرے کے چاروں طرف بہت سے کمرے ہیں جن پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور ان پردوں کے پیچھے چوڑیوں کی کھنکناہٹ دھیمی دھیمی مغموم سرگوشیاں اور دبی دبی آہیں سنائی دے رہی ہیں۔ کسی کسی کمرے میں نوعمر بچوں کی شور مچانے والی آوازیں بھی بلند ہو رہی تھیں۔ جب ان آوازوں کا شور ایک خاص آہنگ سے زیادہ بلند ہو جاتا تو دراز قد شخص کے ماتھے پر ناگواری کی لکیریں کھنچ جاتیں۔ ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ پردے کے پیچھے سے بلند ہونے والی سرگوشیاں قابل فہم ہیں لیکن ان کا تعلق کسی ایک زبان سے نہیں ہے۔

ڈاکٹر نے قدرے توقف کے بعد مرض کا حال جاننے کے لئے اس شخص کے رشتے کے

بارے میں سوچا۔

"یہ...... آپکی کون ہیں؟"

"عزیزہ ہیں"

"کیا؟"

"عزیزہ کا مطلب بہت عزت والی اور بہت پیاری بھی"

"آپ سے سمبندھ کیا ہے؟"

"میں ہی رب مجازی ہوں۔"

ڈاکٹر آنکھیں پھیلائے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر آواز صاف کر کے بولا۔ "ڈاکٹر ہونے کے ناطے مجھے جاننا چاہئے کہ روگی کو کیا روگ ہے۔ روگ کے بارے میں جاننے کے لئے آپ سے ان کے سمبندھ کے بارے میں پوچھنا آوشک ہے۔ آپ جو سمبندھ بتا رہے ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آسکا۔"

دراز قد انسان تکلیف کے ساتھ مسکرایا۔

"آپ معلوم کیجئے جو کچھ میرے علم حضوری میں ہے آپ کے روبرو پیش کروں گا"

ڈاکٹر کے چہرے کے تاثرات سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس جملے کو مکمل طور پر نہ سمجھ پانے کے باوجود مطمئن ہے کہ وہ شخص مریضہ کے بارے میں بہت کچھ یا سب کچھ جانتا ہے۔

"یہ دَشا کب سے ہے؟"

"بہت عرصے سے"

پھر دیر تک خاموشی رہی۔ خاموشی اور زیادہ گہری محسوس ہونے لگی تھی کہ برابر کے کمروں سے اسی قابل فہم مگر نامانوس زبان میں سرگوشیاں بلند ہو رہی تھیں۔

دراز قد انسان نے ڈاکٹر کے چہرے پر پریشانی پڑھی اور اس بار وہ تفصیل سے گویا ہوا۔

"عزیزہ ...... میری مراد مریضہ نے مدتوں سے غذا کو منہ نہیں لگایا۔ گھریلو نسخوں سے تیار شدہ ادویات ہونٹوں تک تو پہنچ جاتی ہے لیکن معدے تک نہیں جا پاتیں۔ مریضہ اپنے مرض کا اظہار بذات خود کبھی نہیں کرتیں۔ کبھی کبھی جلدِ بدن بخار کی شدت سے سرخ ہو جاتی ہے۔ ہاتھ رکھ کر محسوس کیا جائے تو تھوڑی ہی مدت میں بدن نم اور برف کی طرح سرد ہو جاتا ہے اور زندگی کے سارے آثار ختم ہوتے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ تنفس کی بے ترتیبی

تردد کا سب سے بڑا سبب ہے۔"

"کس چیز کی بے ترتیبی" ڈاکٹر نے پوچھا۔

تنفس کی" مراد سانسوں کی بے ترتیبی۔"

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی اور جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"کیا میں روگی کو آلہ لگا کر دیکھ سکتا ہوں؟"

"ضرور۔ عزیزہ کبھی بھی پردہ نشین خاتون نہیں رہیں۔"

مریضہ کی سانسیں اس وقت نسبتاً معمول پر تھیں۔ ڈاکٹر نے سینے پر پڑے کام دار دوپٹے کو تہذیب سے ایک طرف کیا اور سینے پر آلہ رکھ کر غور سے سنا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے جلدی سے آلہ ہٹایا اور کان لگا کر کمرے کے ہر کونے سے ابھرتی مہین سے مہین آواز کو سننا چاہا۔ کمرے میں سانسوں کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں تھی۔ اس نے پھر آلہ لگایا۔ اس کے چہرے پر پھر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ دیر تک آلے کو سینے پر رکھے آنکھیں بند کئے کچھ سنتا رہا۔ مریضہ کے چہرے پر، جتنے وقت تک آلہ رہا اطمینان رہا۔ ڈاکٹر نے آلہ ہٹایا اور بے چین آواز میں بولا۔

"روگی کا دل بہت اچھی حالت میں ہے۔ کسی روگ کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔"

دراز قد انسان کے چہرے پر کوئی تحیر نمودار نہیں ہوا۔

"کیا اس بات سے آپ کو اچرج نہیں؟"

"نہیں" دراز قد انسان کا جواب مختصر تھا۔ ڈاکٹر کو اس جواب کی امید نہیں تھی لیکن اس نے خود کو سنبھالا اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"اب جو بات آپ کو بتاؤں گا اسے سن کر آپ اچھل پڑیں گے۔ روگی کے دل سے سنگیت کی لہریں نکل رہی ہیں جنہیں میں نے کئی بار سنا۔"

دراز قد انسان دھیمے سے وقار کے ساتھ مسکرایا اور آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔

دراز قد انسان کے اطمینان پر ڈاکٹر کو حیرت ہوئی لیکن اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"ہرن کی چال سے جو دھن پھوٹ رہی تھی اس میں ندی کے بہنے کی کل کل تھی۔ ہوا کی مدھ بھری سرسراہٹ تھی، پنچھیوں کی چہکار تھی......"

دراز قد انسان نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ڈاکٹر کو محسوس ہوا کہ دراز قد انسان کی

پچھلی بات کو یاد کر کے کہیں کھو گیا ہے۔ دراز قد انسان گویا ہوا۔

"اس آواز میں میدان جنگ میں طبل پر پڑنے والی پہلی ضرب کی آواز کا ارتعاش بھی ہوگا۔ دو محبت کرنے والے بدن جب پہلی بار ملتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنے ہونٹوں سے محسوس کرتے ہیں وہ نرم لذت بھری آواز بھی ہوگی۔ ملاگیری رنگ کی عبا پہنے صوفی کے نعرہ مستانہ کی گونج بھی ہوگی۔ دربار میں خون بہا کا فیصلہ کرنے والے بادشاہ کی آواز کی گرج بھی شامل ہوگی۔ صحراؤں میں بہار کی آمد سے متشکل ہونے والی زنجیر کی جھنک بھی ہوگی اور بنجر زمین پر پڑنے والے موسم برشگال کے پہلے قطرے کی کھنک بھی ہوگی۔ بربط، ستار اور طبلے کی ... "وہ خاموش ہو گیا۔

"ہاں کچھ اس پرکار کی آوازیں ہیں پر انہیں شبدوں میں بتا پانا بہت کٹھن ہے۔" ڈاکٹر بولا۔

اچانک برابر کے کمرے سے ایک نوعمر لڑکا نکلا۔

"ڈاکٹر نے لیڈی کو کیا روگ بتایا اندر سے انکوائری کی ہے۔"

یہ آواز سنتے ہی مریضہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور سانسیں یکایک بے ترتیب ہو گئیں۔ دراز قد شخص کے چہرے پر ناگواری کا دھواں پھیل گیا۔

"اندر جاؤ۔ اندر جاؤ۔ خبردار بلا اجازت یہاں قدم نہ رکھنا۔" نوعمر بچہ حیرت سے اسے دیکھتا ہوا اندر چلا گیا۔

ڈاکٹر نے مریضہ کے سنہرے بالوں میں کنگھی کرنے والے انداز سے جڑوں تک انگلیاں لے جا کر کاسہ سر پر ہتھیلی جما دی۔

"فیور بڑھ رہا ہے" وہ بڑبڑایا۔ پیشانی کے پسینے کے قطروں سے اپنی ہتھیلی کو نم کرتا ہوا وہ آنکھوں تک ہاتھ لے گیا۔ انگوٹھے کے نرم پیٹ سے آنکھ کے پپوٹے کو آہستگی سے اوپر اٹھایا۔ آنکھوں کی سفیدی چمکی۔ رخساروں کی گرمی ہاتھ کی پشت سے محسوس کرتا ہوا وہ دھیمے سے بڑبڑایا۔

"شریر ٹھنڈا پڑ رہا ہے۔"

دراز قد انسان کے چہرے پر فکر کے سائے تھرتھرائے۔ وہ دھیمے سے بولا۔

"اصل مرض کا تعلق تنفس سے ہے۔"

ڈاکٹر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کچھ سوچا اور پھر مریضہ کے ابھرتے ڈوبتے سینے پر آنکھیں جما دیں اور بے ترتیب سانسوں کا معائنہ کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے سیدھے کھڑے

ہو کر بہت یقین کے ساتھ کہا۔

"اس روگی کے سارے شریر میں جیون ہے۔ کیول سانس کی پرابلم ہے اور یہی سب سے بڑی پرابلم ہے۔ پھیپھڑے کی خرابی کا کوئی علاج نہیں ہے۔"

"کیا آپ کو یقین کامل ہے کہ اعضائے تنفس قطعاً بیکار ہو چکے ہیں؟" ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے ڈاکٹر کو آسان زبان میں سوال سمجھایا۔

ڈاکٹر نے آلہ لگا کر پہلی بار پھیپھڑوں کو دیکھا۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"بڑی وچتر بات ہے۔ پھیپھڑے بالکل ٹھیک ہیں پر پوری سانس نہیں لے پا رہے۔"

"پوری سانس لینے سے بدن کے دیگر اعضا کی قوت کا کیا تعلق ہے"؟ دراز قد انسان نے سوال کیا

"بہت بڑا سمبندھ ہے۔ تازہ ہوا جب پھیپھڑوں کے راستے رکت میں ملتی ہے تو جیون کا سروپ بنتا ہے۔ وہ جیون رکت کے ساتھ مل کر شریر کے ہر انگ کو شکتی دیتا ہے۔ پوری ہوا نہ ملے تو رکت۔۔۔ لال رکت تھوڑی دیر بعد نیلا پڑ جاتا ہے اور شریر کے ہر بھاگ میں روگ چھا جاتا ہے۔"

"آپ کا گمان ہے اعضائے تنفس اپنا کام بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں تو پھر بدن میں تازہ ہوا کی کمی کیوں ہے؟"

"شریر میں تازہ ہوا کی کمی اس لئے ہے کہ اس کمرے میں تازہ ہوا نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

"اس کمرے میں کھلنے والے باقی کمروں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور ان کمروں میں باہر کی طرف بے شمار کھڑکیاں ہیں" دراز قد انسان نے تفصیل سے بتایا۔

"پر مجھے لگتا ہے کہ کسی کھڑکی سے تازہ ہوا نہیں آ رہی۔"

دفعتاً برابر کا ایک کمرا کھلا اور ایک نو عمر لڑکی فراک اسکرٹ پہنے داخل ہوئی۔

"ماما نے پوچھا کہ لیڈی کا فیور ڈاؤن ہوا کہ نہیں؟"

مریضہ کا بدن ایک لمحے کو تڑپا اور سانس پھر بے ترتیب ہو گئی۔

"دور ہو جاؤ میرے نگاہوں کے سامنے سے۔ نا ہنجار" دراز قد انسان شدید طیش کے عالم میں دانت پیستے ہوئے آواز کے آہنگ کو کم کرتے ہوئے بولا۔

"آپ اینگری کیوں ہوتے ہیں۔ میرے کو حال پوچھنے اندر سے ماما بھیجتی ہے۔ میری

مسٹیک کدھر ہوتی۔" لڑکی نے ناک پھلا کر احتجاج کیا۔

اس لڑکی کے الفاظ، لہجے اور آواز سے دراز قد انسان پر پاگل پن جیسا دورہ پڑ گیا۔ ڈاکٹر نے بمشکل اسے سمجھایا۔ لڑکی کو ہاتھ کے اشارے سے اندر جانے کو کہا۔

پھر ڈاکٹر بولا۔ "میرے پاس ایک ہی دوا ہے۔ اس پرکار کے روگی کے لئے کسی بھی ڈاکٹر کے پاس ایک ہی میڈیسن ہوتی ہے۔ وہ میڈیسن دے کر پھیپھڑوں کی باریک باریک نسوں کو پھلایا جاسکتا ہے تاکہ ان میں تازہ ہوا بھلی بھانت بھر جائے۔ پر.........."

"پر کیا؟......" دراز قد انسان نے بے صبری سے پوچھا۔

"پر یہ دوا تبھی کام کرتی ہے جب روگی کو اچھی ماترا میں تازہ ہوا مل سکے۔ تبھی تو پھیپھڑوں کی پھولی ہوئی نسوں میں ہوا جاسکے گی۔ جب تازہ ہوا ہی نہ ہو تو کیو پھیپھڑوں کی نسوں کو پھلا کر کیا کیا جاسکتا ہے۔"

"تب"؟ دراز قد انسان نے متفکر ہو کر پوچھا۔

"اس کا کوئی اُپائے نہیں ہے۔" ڈاکٹر کا لہجہ مایوسانہ تھا۔ پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔

"کیا روگی کا کمرہ بدلا نہیں جاسکتا۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نہیں یہ عزیزہ کا مخصوص کمرہ ہے۔ زندگی اسی میں گزری ہے۔ باہر پھیلی تمام عمارتوں کے درمیان یہ کمرہ عزیزہ کے علاوہ کسی کو نہیں دیا جاسکتا۔"

"لیکن روگی کو اس کمرے کے علاوہ دوسرا کمرہ تو دے سکتے ہیں۔"

"لیکن بنا تازہ ہوا کے روگی اتنے دن تک جیوت کیسے رہا؟"

تازہ ہوا کی کمی کا مسئلہ بہت پرانا نہیں ہے۔ اس کمرے کے چاروں طرف مریضہ کے متعلقین کے کمرے ہیں۔ ان میں دریچے اور روشندان ہیں، دروازے ہیں لیکن وہ لوگ ان کو کھولتے نہیں۔"

"کیا ان لوگوں کو دوسروں سے ملنے کے لئے اپنے کمروں سے نکلنا نہیں پڑتا۔"؟

"نہیں۔ انہوں نے سہولت اور آرام کے پیش نظر دوسروں سے ملنے کے لئے اندر ہی اندر دیواروں میں راستے بنا لئے ہیں۔"

"پھر تو بہت اچنبھے کی بات ہے کہ روگی اب تک جیوت کیسے ہے۔ دن رات اسی پرانی ہوا میں جیوت رہنا بہت کٹھن ہے۔"

بادِ صبا کا انتظار

"نہیں۔ دراصل اس عمارت کے ایک کمرے میں شام ڈھلے باہر کا دروازہ کھلتا ہے اور تازہ ہوا کی ایک لہر اندر آجاتی ہے۔ شاید اسی سے کاروبارِ ہستی قائم ہے۔ یوں بھی عزیزہ بہت سخت جان ہے۔" وجیہہ مرد نے بستر پر لیٹی خاتون کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

"میں نے اس پر کار کا روگی پہلی بار دیکھا ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان کے اور ناطے دار بھی ہیں۔ کبھی کبھی بیماری پرکھوں سے بھی مل جاتی ہے۔"

"عزیزہ کی کئی بہنیں ہیں۔ ایک بہن بہت معمر ہے۔ اس کا گھر اس ملک سے باہر ہے۔ وہ نوجوانوں کی طرح تر و تازہ ہے۔ وہ اپنے دیس کے باہر بھی عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔"

"اور؟"

"ایک بہن جو اس سے کچھ بڑی ہیں وہ بھی اس ملک سے باہر رہتی ہیں اور اپنے ملک میں بہت خوش و خرم ہیں۔ تمام تر عیش و لذت کوشی ان کی قسمت میں نوشت کر دی گئی ہے۔ ایک بہن اس ملک میں بھی ہے۔ اور بہت آرام سے ہے۔ اس کے متعلقین عزیزہ کو بھی اس کی روش پر چلانا چاہتے ہیں لیکن مریضہ کے عزیزوں نے انکار کر دیا۔"

"کیا اس بہن کے چال چلن میں کوئی برائی ہے؟" ڈاکٹر نے آلہ گردن میں لٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں کوئی برائی نہیں لیکن اگر عزیزہ اس کی چال چلتی تو اپنا آپا کھو دیتی۔"

اچانک دراز قد شخص کو کچھ یاد آیا۔ وہ ہلکے ہلکے جوش کے انداز میں گویا ہوا۔ "عزیزہ کے بزرگوں میں ایک ضعیفہ ہے۔ اُن کے گھر والے انہیں بہت عزت دیتے ہیں لیکن کبھی گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ مسموع ہوا کہ وہ طاقت ور ضعیفہ محبوس ہو کر اب کمزور ہو گئی ہیں۔ ان کے متعلقین احتراماً انہیں سلام تو کر لیتے ہیں لیکن کوئی اُن کے پاس دیر تک بیٹھنا گوارا نہیں کرتا۔"

یکایک کسی پردے کے پیچھے سے دال بھات مانگنے کی آواز آئی۔ یہ ایک شیریں نسوانی آواز تھی۔ وہ آواز تھوڑی دیر بعد رام سیتا، لنکا اور ہنومان کے قصے سنانے لگی۔

ڈاکٹر نے دراز قد انسان کو حیرت سے دیکھا جیسے اسے اعتبار نہ آیا ہو لیکن دراز قد انسان کے چہرے کے سنجیدہ تیوروں نے ڈاکٹر کا اعتماد اسے واپس کیا۔

ڈاکٹر نے مریضہ پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"آپ بتا رہے تھے کہ شام ڈھلے برابر کے کمرے کی کھڑکی سے تازہ ہوا کا جھونکا اندر آتا ہے؟"

"ہاں! حالاں کہ وہ وقت شام کا وقت ہوتا ہے لیکن وہ ہوا بادِ صبا کی طرح دل خوش کن ہوتی ہے۔"

"کیا شام ڈھل چکی" دراز قد انسان نے بے چینی سے پوچھا۔

"نہیں ابھی کچھ دیر ہے۔ کیا آپ کو سمے بیتنے کا اندازہ نہیں ہوتا؟ دراز قد انسان خاموش رہا۔ اس سوال کے اندر ایسا کچھ تھا جس نے اسے مزید بے چین کر دیا۔

ڈاکٹر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ جب یہ نظریں سوئی بن کر دراز قد انسان کے چہرے پر جگہ جگہ کھب گئیں تب اس نے گہری اور مجبور آواز میں کہا۔

"نہیں"۔

"اچرج کی بات ہے۔" ڈاکٹر اور کچھ نہیں بول سکا۔

لیکن اس کی نگاہیں مرد کے چہرے پر جمی رہیں۔ مرد ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ دھیمے دھیمے گویا ہوا۔

"بہت دنوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر گھڑی وقت غروب چھایا ہوا ہے۔"

"کیا آپ بھی ہر وقت دیواروں کے بیچ بند رہتے ہیں؟" ڈاکٹر نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

اس مرتبہ مرد کی خاموشی مہیب تھی۔ ڈاکٹر سہم کر رہ گیا۔

مرد نے ڈاکٹر کی دلی کیفیات کا اندازہ لگا لیا۔ شگفتہ لہجے میں بولا۔

"بہت سی باتیں پر اسرار ہوتی ہیں اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں بھید پر سے پردہ ہٹا بھی دوں تب بھی آپ پوری بات نہیں سمجھ سکیں گے۔"

دونوں دیر تک خاموش رہے۔ پھر ڈاکٹر نے پہل کی۔

"میں بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جب تازہ ہوا کا جھونکا اس کمرے میں آتا ہے تو روگی کی حالت میں کس طرح کا فرق آتا ہے؟"

"شام ڈھلے آپ دیکھ لیجیے گا"

"شام ڈھلنے میں ابھی دیر ہے۔"

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ ڈاکٹر کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس مرد کے علاوہ کسی اور کو خاتون کی زندگی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ مریض کی حالت پوچھنے والیوں کو اس نے دیکھا نہیں لیکن اتنا اندازہ تھا کہ وہ بھی مریض کی حالت میں بس اتنی ہی دلچسپی لے رہی ہیں جیسے لوگ موسم کی تبدیلی کے بارے میں ایک دوسرے سے معلوم کرتے ہیں۔ اس کی سمجھ کام نہیں کر رہی تھی کہ اس رعب دار مرد کی اس آبادی میں کیا حیثیت ہے۔ اس عمارت کے دوسرے مکینوں سے اس کا کیا تعلق ہے اور باہر پھیلی ہوئی اس بستی سے مرد کا کیا علاقہ ہے۔ اس کے دل میں رہ رہ کر سوال اٹھ رہے تھے لیکن وہ مرد کے لہجے کی سنجیدگی اور موقع کی نزاکت کے پیشِ نظر زیادہ سوالات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے کچھ گھما کر معلوم کرنا چاہا۔

"یہ باہر کا علاقہ کس کا ہے؟"

"کیا آپ پہلی مرتبہ آئے ہیں؟"

"جی ہاں۔ بس دور سے دیکھتا رہتا تھا۔ دیکھنے میں یہ پوری آبادی بہت اچھی لگتی تھی۔ دور سے ان عمارتوں کی اونچائی، مضبوطی اور پرانا پن من کو کھینچتا تھا۔ آج قریب سے بازار بھی دیکھا۔ رنگارنگ چیزیں، طرح طرح کی پوشاکیں، الگ الگ نسلوں کے لوگ، پھر ہو حق کرتی سادھو سنتوں کی آوازیں۔ میں زیادہ نہیں دیکھ پاتا تھا۔ لیکن لکھیا اینٹ کی باہر کی ایک عمارت کو دیکھ کر من کو بہت شانتی ملی کہ اس آبادی میں ایسی سادگی بھی ہے۔"

"آیئے میں آپ کو آبادی کی ایک جھلک دکھادوں۔ جب سورج ڈھلنے کا وقت قریب آجائے تب مجھے بتا دیجئے گا۔ ہم لوگ مریضہ کے پاس واپس آجائیں گے۔"

ساگوان کے سیاہی مائل اونچے دروازوں کو کھول کر وہ دونوں باہر نکلے۔ غلام گردش میں کئی طرح کے لوگ ملے لیکن کوئی ان دونوں سے مخاطب نہیں ہوا۔ ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ مخاطب کوئی نہیں ہوتا لیکن تمام افراد اس بارعب، وجیہہ اور خوش پوش مرد کو عقیدت و محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ غلام گردش کا یہ حصہ چوڑی سیڑھیوں والے ایک زینے کے مقابل تھا۔ دونوں اس پر چڑھے۔ اونچی نیچی چھتوں والی بے شمار عمارتوں کو عبور کرتے ہوئے وہ لوگ زینے پر چڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ سب سے اونچی چھت آگئی۔ چھت پر کنگورے دار حصار تھا۔ مرد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر حصار کے پاس لا کر کھڑا کر دیا۔ نیچے پوری بستی پھیلی ہوئی تھی۔ چھت پر ابھی سورج کی زرد شعاعیں تھیں لیکن نیچے — بہت نیچے بستی میں اندھیرا اتر چکا تھا۔

ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ اندھیرا اترنے کے باوجود نیچے ابھی بھی رونق ہے۔ تب اسے محسوس ہوا کہ رونق کا لطف روشنی سے نہیں آبادی سے ہوتا ہے۔ یہ بلند اور مضبوط عمارت چاروں طرف سے بازاروں سے گھری ہوئی تھی اور اس عمارت سے متصل لکھیا اینٹ کی وہ عمارت بھی ریشم جیسے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی جہاں اس نے ہو حق کی صدائیں سنی تھیں۔

"یہ سب کس کا ہے؟" اس نے نیچے آبادی پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

یہ عمارتیں، یہ ستون، یہ بالاخانے، یہ حصار، یہ بازار یہ ہو حق کی صدائیں یہ سب میری ہی ...... ان سب کا مجھ سے ہی علاقہ ہے۔"

مرد نے متانت کے ساتھ جواب دیا۔

لکھیا اینٹ کی اس سادہ عمارت میں کچھ سفید پوش سائے نظر آئے جن کے چہروں کے خطوط ملگجے اندھیرے کی وجہ سے صاف نظر نہیں آرہے تھے۔

"وہ ...... وہ کون لوگ ہیں؟" ڈاکٹر نے بے صبری سے پوچھا۔

مرد نے ادب سے ان سایوں کو دیکھا اور تھوڑی دیر بعد بولا۔

"وہ عمارت اور سفید پوش ہو حق کی صدائیں بلند کرنے والے سب اسی بستی کا حصہ ہیں۔ بازار کے تمام افراد بھی اسی بستی کا ایک حصہ ہیں۔ اس عمارت کے سارے مکین بھی اسی بستی کا ایک حصہ ہیں اور یہ سب کے سب اس مریضہ کی بیماری سے آدھے ادھورے رہ گئے ہیں۔"

"مطلب"؟ ڈاکٹر کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"سب اسی خاتون کے حوالے سے اپنی زندگی گزارتے تھے۔ شعوری طور سے کسی کو احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ مریضہ ان کے لئے کتنی کار آمد ہے لیکن جب سے وہ بیمار ہوئی ہے، کمزور ہوئی ہے سب خود میں کچھ نہ کچھ کمی پارہے ہیں۔"

"یہ باتیں تو پہیلیوں جیسی ہیں۔" ڈاکٹر دھیمے سے بولا۔ اب اسے ڈر لگنے لگا تھا لیکن اب اس کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگا تھا۔ جب سورج کی آخری شعاع ماند ہو کر اندھیرے میں کھو گئی تو اس پھیلی ہوئی آبادی میں استادہ اس عظیم الشان عمارت کی وسیع و عریض چھت کے حصار کے پاس کھڑے ہو کر اس نے خود کو مرعوب پایا۔ لیکن اب اس سے رہا نہیں گیا۔

"روگی کون ہے آپ نے اب تک نہیں بتایا؟ آپ نے اب تک روگی سے اپنے رشتے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" چھت کی کھلی فضا میں ڈاکٹر نے ہمت پا کر سوال کیا۔

مرد حصار کے نیچے جھانکتا رہا۔ پھر یکایک بولا۔

"آپ خود کچھ نہیں سمجھ سکے؟" مرد کی آنکھوں میں ایک دکھ بھرا سوال تھا۔

تب ڈاکٹر کو اچانک ایسا لگا جیسے پردہ سا ہٹ گیا ہو۔ اسے یاد آیا جب اس نے مریضہ کے دل کی دھڑکنیں سنی تھیں تو اسے کچھ آوازیں بھی سنائی دی تھیں جنہیں وہ اس سے پہلے بھی بار ہا سن کر خوش ہو چکا تھا۔

اب اس نے بغور اس وجیہہ مرد کو دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"شام ڈھل گئی ہے۔ آیئے نیچے چلیں۔ روگی کو دیکھ لیں۔"

وہ دونوں تیزی سے نیچے اترے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی انہیں محسوس ہوا کہ برابر والے کمرے سے ہوا کے تازہ جھونکے آ رہے ہیں۔ مریضہ بستر پر گاؤ تکیے کے سہارے وقار کے ساتھ بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر سرخی جھلک آئی تھی۔ ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر اس نے کوئی تکلف نہیں کیا لیکن مرد کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شکر گذاری کے جذبے لہرائے۔

"کیسی ہو؟" مرد نے کمال محبت کے ساتھ قریب جا کر دھیرے سے پوچھا۔

وہ بدقت مسکرائی۔ بڑی بڑی آنکھوں سے مرد کا جائزہ لیا اور ادب سے بولی۔

"اس وقت تو اچھی ہو جاتی ہوں۔"

"ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ تمہارے اعضائے رئیسہ مکمل طور پر تندرست ہیں۔ بس سانس لینے بھر کو تازہ ہوا کی کمی ہے۔"

مریضہ خاموشی کے ساتھ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"آپ اتنا پریشان کیوں ہوتے ہیں۔" وہ دیر کے بعد بولی۔

"تم جانتی ہو کہ اس بستی کا کاروبار ہستی میری وجہ سے قائم ہے۔ تم نصیب دشمناں ختم ہو گئیں تو دھیرے دھیرے سب کچھ خس و خاشاک ہو جائے گا۔"

"کیا" ڈاکٹر نے انہیں روک کر پوچھا۔ "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ برابر والے کمرے کی کھڑکی ہمیشہ کھلی رہے اور تازہ ہوا آتی رہے۔"

"برابر والے کمروں میں جہاں اور مکین ہیں وہیں کچھ نوجوان بھی ہیں۔ چاروں طرف بنے ان کمروں میں صرف ایک کمرہ ایسا ہے جس کے مکین نے باہر کی کھڑکی کھول رکھی ہے۔ شام کو جب وہ واپس آتا ہے تو دروازہ کھول دیتا ہے۔ تبھی تازہ ہوا کے جھونکے اندر آ پاتے ہیں۔

دن بھر روزی روٹی کے چکر میں مارامارا پھرتا ہے۔ شام ڈھلے واپس آ پاتا ہے۔"

باقی لوگ بھی اپنی رہائش گاہوں کی کھڑکیاں کھول کر ادھر والے دروازے نہیں کھول سکتے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"غالباً انہیں اب اس خاتون سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"اس نوجوان کو دلچسپی کیوں ہے؟"

"کیوں کہ وہ اس خاتون کو زندہ دیکھنا چاہتا ہے۔"

"وہ کیوں"

"کیوں کہ اسے اپنے اجداد سے محبت ہے۔"

یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔" ڈاکٹر نے بہت مایوسی کے عالم میں کہا۔

"میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ اگر میں کچھ بتانا بھی چاہوں تب بھی ضروری نہیں کہ ہر بات آپ کی سمجھ میں آسکے۔" مرد نے رنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

"کیا میں کچھ کر سکتا ہوں۔" ڈاکٹر نے جیسے ہتھیار ڈال دیئے ہوں۔

"آپ ڈاکٹر ہیں۔ آپ ہی بہتر بتا سکتے ہیں کہ آپ کیا کر سکتے ہیں؟"

تب ڈاکٹر نے بہت مضبوط لہجے میں لیکن ادب کے ساتھ کہا۔ میں صرف پھیپھڑوں کو مضبوط کرنے والی دوا دے سکتا ہوں لیکن پھیپھڑوں کی مضبوطی کی اصل دوا اور اصل تازہ ہوا ہوتی ہے۔" اس ماحول میں اتنی دیر تک رہنے کے بعد وہ اب صاف وشفاف زبان میں بات کر سکتا تھا۔ وہ پھر گویا ہوا۔

"اس عمارت کے تمام نوجوان مکینوں سے کہئے کہ وہ باہر کھلنے والی تمام کھڑکیاں کھول کر اس کمرے میں کھلنے والے دروازے کھول دیں۔"

"اگر وہ ایسا نہ کریں... تب ... تب کیا ہوگا؟" مریضہ نے بہت بے صبری کے ساتھ پوچھا۔

"تب" ڈاکٹر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تب یہ ختم ہو جائیں گے" اس نے دراز قد وجیہہ مرد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

حسین وجمیل مغموم مریضہ اور دراز قد وجیہہ مرد نے ایک دوسرے کو کن نگاہوں سے دیکھا، یہ کوئی نہیں دیکھ سکا کیوں کہ ڈاکٹر دھیرے سے بیگ اٹھا کر خاموشی سے باہر نکل آیا تھا۔

○○

نجات

وہ ماہوٹ کی اندھیری رات تھی۔ تیز، سرد ہوائیں وقفے وقفے سے شور مچاتیں اور چپ ہو جاتیں۔ دالان کے پردوں کے شگاف سے ہو کر بھیگی ہوئی ہوا کے جھونکے اندر آ کر موٹے موٹے لحافوں میں چھید کیے دے رہے تھے۔ لوہا بجنے کی آواز ڈیوڑھی اور آنگن کو پار کر کے مدھم ہوتی ہوئی کانوں سے پھر ٹکرائی۔ اس سے پہلے ہم لوگ اس آواز کو وہم سمجھے تھے۔ مغربی دالان سے پچا نے لحاف سے منہ نکال کر قدرے بلند آواز میں کہا۔

"دروازے پر کوئی ہے"۔ یہ کہتے کہتے وہ اٹھے اور سرہانے سے ٹارچ اور پلنگ کے نیچے سے ہاتھ بھر کا ڈنڈا اٹھا کر آنگن میں نکل آئے۔ ہم پردوں کے پیچھے دالان میں چپّی مارے لحاف لپیٹے خاموش لیٹے تھے۔ ابا نے بدقت لحاف کو خود سے الگ کیا۔ سرہانے کی طرف زمین پر رکھی

لالٹین کی لو اونچی کی اور پلنگ کی پٹی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ پھر کچھ سوچ کر تیزی سے اٹھے اور آنگن کو عبور کرتے ہوئے صدر دروازے پر اتنی تیزی سے پہنچے کہ چچا بڑے دروازے کی کنڈی بھی نہیں کھول پائے تھے۔ چچا نے مڑ کر دیکھا اور بڑے بھائی کو پشت پر دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ کنڈی گرا کر صدر دروازے کے دونوں پٹ کھینچ کر کھولے۔ تیز ہوا نے دونوں بھائیوں کے بدن کا ہر وہ حصہ برف کر دیا جو کھلا ہوا تھا۔

سامنے شبراتی کھٹ بُنا سکڑا سمٹا شرمندہ سا کھڑا تھا۔ اتنی تیز سردی کے باوجود وہ صرف ایک پرانی بنڈی پہنے تھا جس کا رنگ پہچاننا اس اندھیرے میں اور بھی مشکل تھا۔

"گھر میں کو بچہ ہوا ہے۔ کان میں دعا پڑھوانا ہے۔" اس نے سلام کر کے نیچی نظریں کیے مسکراتے ہوئے یہ اطلاع دی۔

"مبارک ہو" ابا نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ الا...... "چچا زیر لب بڑبڑائے۔

ابا بولے "ایسا کرو شبراتی کہ بچے کے سیدھے کان میں اذان پڑھو اور بائیں کان میں اقامت، کلمے کی انگلی سے شہد چٹاؤ اور چھوٹی چمچی سے نیم گرم پانی تھوڑا تھوڑا پلاؤ۔"

"پانی وانی والی بات تو ٹھیک ہے۔ پر دعا آپ ہی کو پڑھنی ہے" کھٹ بنا کنمنایا۔

میں بھی اتنی دیر میں سرد ہواؤں سے الجھتا، دوڑتا، آنگن عبور کر کے ڈیوڑھی میں آ کر دروازے کا پٹ پکڑ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ ابا، چچا سے بولے۔

"تم شبراتی کے گھر ہو آؤ۔ اذان اور اقامت پڑھ دینا۔" پھر سرگوشیوں میں برہمی کے انداز میں بڑبڑائے۔

"ہر سال ایک بچہ۔ حد ہو گئی۔" مجھ پر نظر پڑی تو ماتھے پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔

"تم سے کس نے کہا تھا یہاں آنے کو۔ چلو اندر جا کر لیٹو۔"

"میں بھی کھٹ بنے کا بچہ دیکھوں گا۔"

"نہیں! بچے ایسی جگہوں پر نہیں جاتے۔"

"بھائی جان جانے دو۔ دور کھڑا رہے گا۔" چچا نے سفارش کی۔

جب ہم چچا بھتیجے شبراتی کے گھر پہنچے تو دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ شبراتی کھنکھار کر اندر داخل ہوا۔

"چھوٹے میاں آئے ہیں۔ پردہ کرلو۔" اس نے قدرے بلند آواز سے کہا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی کچی مٹی کا ایک دالان نظر آیا اور کچھ بھی نہیں۔ میں نے اندھیرے میں غور سے دیکھا۔ ایک بے چھت کا، کمر کی اونچائی بھر کا کچا بیت الخلا بھی دروازے سے ملحق تھا۔

یہ لوگ قدمچوں پر کھڑے ہو کر کمر بند باندھتے ہیں یا نیچے اتر کر۔ مجھے کچھ سوچ کر بڑے زور سے ہنسی آئی مگر میں نے چالاکی سے اسے ضبط کیا۔

دالان میں مٹی کے تھملے کے پیچھے کھٹیا پر لیٹی شبراتی کی عورت نے ادھڑی ہوئی رضائی سے سر اس طرح چھپایا کہ سرہانے کی طرف اس کے سیدھے ہاتھ نے مڑ کر کلائی کی ہڈی کی مدد سے ایک فریم سا بنالیا۔ میں نے فوراً اندازہ لگالیا کہ کھٹ بنے کی بیوی ایک عقل مند عورت ہے۔ اس طرح لیٹنے میں رضائی کے اندر سانس لینے میں بھی آسانی ہورہی ہوگی اور پردے کا پردا ہوگیا۔ کھٹیا کے پاس زمین پر ایک کالی موٹی خونخوار عورت المونیم کے تسلے میں خون میں ڈوبے چیتھڑے اور کچھ اس سے بھی زیادہ خوفناک چیزیں لئے بیٹھی تھی۔

چچا نے اسے 'دائی ماں' کہہ کر سلام کیا۔ جواب دینے میں اس کے دانت چمکے تو میں سہر اٹھا لیکن اس کی آواز اور لہجے میں بڑی نرمی اور ادب تھا۔ میرا دل چچا کے تئیں عقیدت سے سرشار ہوگیا۔

ماں کے اُدھر ایک چھوٹے سے گدے پر سیاہی مائل سرخ لوتھڑا آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ ابھی اسے کپڑے نہیں پہنائے گئے تھے۔ مختلف رنگوں کے پرانے، موٹے، ادھڑے پھٹے کپڑوں سے اسے ڈھانپے رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ چچا نے جلدی جلدی سیدھے کان میں اذان اور الٹے کان میں اقامت کے کلمے پڑھے۔

"شہد لاؤ۔" چچا نے شبراتی کو مخاطب کیا۔

شبراتی نے دیوار کے سہارے پیال پر لیٹے بیٹھے اپنے حیران بچوں کے قریب جاکر سرگوشیوں میں کچھ پوچھا۔ وہ 'ناں ناں' کرنے لگے۔ وہ گھبرایا ہوا بیوی کی کھاٹ کی طرف مڑا۔ ہم دونوں کو دیکھ کر بیوی سے کچھ بول نہیں سکا۔ چچا مجھے لے کر دروازے کے قریب کھسک آئے۔ وہ بیوی کی کہنی ہلا ہلا کر کچھ پوچھ رہا تھا جو رضائی کے اندر نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ وہ پوچھتے پوچھتے کھسیا گیا۔ اس کی آواز غالباً تیز ہوجاتی اگر چچا اس کا نام لے کر اسے قریب نہ بلا لیتے۔

''شکر سے بھی کام چل جائے گا۔ شکر ہے؟'' وہ خوش ہو گیا۔ تیزی سے اندر گیا اور بڑے بیٹے سے کچھ پوچھا۔ وہ دیر تک لہجے کو تیز اور آواز کو نرم بنا کر کچھ پوچھتا رہا۔ اچانک اس کا بڑا بیٹا بلبلا کر رونے لگا۔

''ادھر آؤ شبراتی۔'' چچا نے تیز لہجے میں آواز دی۔ شبراتی کھسیایا ہوا ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

''گھر میں تھوڑا سا چٹکی برابر گڑ ہو گا؟''

''گڑ کا تو مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ نہیں ہے۔ مغرب کے بعد سارے بچوں کے ساتھ آج گڑ سے روٹی کھائی تھی۔ جو بچا تھا دائی اماں نے پانی میں گھول کر بچوں کی ماں کو پلوا دیا تھا''۔

میں نے دیکھا چچا کے چہرے پر کچھ عجیب و غریب رنگ آ رہے ہیں۔ بدقت انہوں نے خود پر قابو پایا اور سمجھانے والے انداز میں دھیمے دھیمے شبراتی سے کہا۔

''شہد، شکر یا گڑ فرائض و واجبات میں نہیں ہیں۔ کانوں میں اذان دی جا چکی ہے۔ اب تم اسے گنگنا پانی پلا دینا۔ بچے کی ماں کو گرم گرم دودھ پلاؤ اور تب اس سے کہو کہ بچے کو دودھ پلائے۔ سمجھے؟''

شبراتی دالان میں گھسا۔ دیر تک گھسا رہا۔ سرگوشیوں میں بیوی اور بچوں سے باتیں کرتا رہا اور جب روہانسا ہو کر دالان سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں ایک برتن تھا جو ایسے گھروں میں عام طور پر دودھ رکھنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چچا دیر تک ماں کی صحت، اس کی غذا اور اور اس غذا سے بچے پر مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں نرمی سے سمجھاتے رہے۔ شبراتی سب کچھ سنتا رہا اور نیت باندھے کھڑا رہا۔ تب چچا کی نظر اس برتن پر پڑی جو بالکل خالی تھا۔ چچا نے 'اونہہ' کہہ کر میرا ہاتھ پکڑا اور تقریباً کھینچتے ہوئے مجھے گھر کی طرف لے چلے۔ تھوڑی دیر بعد جب میں اماں سے تھوڑا سا شہد اور پتیلی بھر دودھ لے کر چچا کی نظر بچا کر شبراتی کے گھر کی طرف جا رہا تھا تو آسمان کے نچلے حصے میں ایک میلی میلی صبح نمودار ہو رہی تھی۔

☆

ایوب دن بھر جانگیا پہنے گلی میں گھومتا رہتا۔ ناک بہتی رہتی اور میل کی تہیں جمتی رہتیں۔ ایک دن میں نے ابا سے کہا کہ کھٹ بنے کے بجے ایوب کو مدرسے میں بٹھا لیجئے۔ انہوں

نے حامی بھر لی۔ میں بھاگا بھاگا گیا اور ایک بغدادی قاعدہ ، تختی ، ملتانی مٹی اور کلک کے قلم خرید لایا اور باقی کے پیسے ابا کو واپس کر دیے جو انہوں نے بغیر گنے جیب میں رکھ لیے۔ گھر سے بالٹی اور مگ لے کر چوک میں کھڑے ہو کر کنویں سے پانی کھینچ کھینچ کر میں نے اسے خوب نہلایا۔ وہ گورے رنگ کا نکلا۔ اس کے بال بہت چیکٹ تھے۔ بڑی مشکل سے صاف ہوئے۔ انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کی۔ اس کی صورت لڑکیوں جیسی نرم نرم تھی۔ ابا نے مونڈھے پر بیٹھے بیٹھے تمام کاموں کا جائزہ لیا اور کہا۔

"آج مکتب کا وقت تو ختم ہو گیا۔ تم اسے اس کی ماں کے پاس لے جاؤ اور کہو کہ قاعدہ اور قلم ایک پاک ستھرے بستے میں رکھیں اور کل صبح اسے صاف صاف کرتا پاجامہ پہنا کر مکتب بھیج دیں۔ میں بسم اللہ پڑھا دوں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ سکے نکالے اور مجھے دے کر کہا۔

ان کے بتاشے لے آنا۔ اتنی صبح بتاشوں کی دکانیں نہیں کھلتیں۔" میں اسے لے کر اس کے گھر گیا۔ اس کے گھر میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی البتہ شبراتی کی سانس بہت پھولنے لگی تھی۔ میں نے ایوب کی ماں سے پاک صاف کرتا پاجامہ اور بستہ تیار کرنے کو کہا۔ وہ مجھے دیکھ کر سر پر دوپٹہ برابر کرنے لگی تھی۔ میری بات سن کر ہاتھ وہیں کے وہیں رہ گئے۔

فجر کی نماز کے بعد منہ اندھیرے میں اس کے گھر پہنچا۔ ایوب تیار تھا۔ راتی رات اس کے باپ کا پاجامہ کاٹ کر اس کے سائز کا کر دیا گیا تھا۔ شبراتی لنگی پہنے سانس سے لڑ رہا تھا۔

"بستہ کہاں ہے؟" میں نے ماہر جاسوس کی طرح چاروں طرف نگاہیں پھینک کر سوال کیا۔ اس کی ماں کچھ نہیں بولی۔ پیٹھ موڑ کر ٹین کا بکس کھولا۔ اس میں صاف اور میلے کچھ کپڑے، دو تین پرانی مذہبی کتابیں اور تھوڑے سے تانبے کے برتن تھے۔ وہ الٹ پلٹ کر ہر کپڑے کو دیکھتی اور ہر کپڑے کی افادیت اسے بستے سے زیادہ نظر آتی۔ میں پیچھے سے صرف اس کے ہاتھ دیکھ پا رہا تھا۔ اس کی انگلیوں کی حرکات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کس کپڑے کو کتنی اہمیت دے رہی ہے۔ کپڑے دیکھتے دیکھتے اس کا ہاتھ صندوق کے فرش سے ٹکرایا۔ میں نے گردن اٹھا کر پیچھے سے ایوب کی ماں کے سر کے اوپر سے نیچے کی طرف دیکھا۔ کپڑے ختم ہو چکے تھے۔ صندوق کے فرش پر پیلے پرانے اردو اخبار بچھے ہوئے تھے۔

میں ایوب کی ماں اور شبراتی کو سنانے کے لئے تعلیم، اس کی اہمیت، مکتب اور اس کے

لوازمات، کتابوں، قلم اور بستے کے بارے میں دیر تک باتیں کرتا رہا یہاں تک کہ وہ تمام الفاظ ختم ہو گئے جو میں نے مکتب کے منشی جی سے سنے تھے۔ شبراتی یہ سب سن کر عالمانہ انداز میں سر ہلاتا رہا اور زمین کو دیکھتا رہا۔ اتنی دیر تک دیکھتا رہا کہ مجھے شک ہونے لگا کہ وہاں کچھ سکے نہ پڑے ہوں۔ میں نے آگے بڑھ کر غور سے دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں ایوب کی ماں کی طرف بڑھا۔ اس نے مجھ سے نظریں نہیں ملائیں، صندوق ایک طرف کر کے چپ چاپ بیٹھ گئی۔

میرے منہ سے بے ساختہ 'اونھ' نکلا۔ میں ایوب کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے گھر کی طرف چلا۔ اسے دروازے پر کھڑا کیا۔ اندر جا کر اماں کی نظر بچا کر قرآن شریف کا جزدان نکال کر لایا اور ایوب کا ہاتھ پکڑ کر مکتب کی طرف چلا جہاں ابا بیٹھے ہم دونوں کا انتظار کر رہے تھے جن کے قریب رات کے لائے بتاشے ایک پڑیا میں بند رکھے تھے۔

مکتب کے باہر ایک کاہل وجود بیمار دن گھٹنوں کے بل دھیمے دھیمے رینگنے لگا تھا۔

☆ ☆

شبراتی اور اس کی بیوی کا انتقال تین راتوں کے وقفے سے ہوا۔ کھٹ بنا پہلے رخصت ہوا۔ اسے دمے کا مرض تھا۔ اس کی بیوی کو دق تھی۔ ایوب اپنے بڑے بھائی بہنوں کے ساتھ میت کی چارپائی کے پاس خاموش کھڑا تھا۔ کفن کا انتظام ہو چکا تھا۔ میں ابھی ابھی نوکری سے چھٹی پر آیا تھا۔ سامان بھی ٹھیک سے نہیں رکھا تھا کہ یہ اطلاع ملی۔ ابھی میت نہیں اٹھی تھی۔ میں جنازے کے مختصر سے جلوس میں آکر شامل ہو گیا۔

محلے کی مسجد کے امام کا اصرار تھا کہ اول منزل میں دیر نہ کرو۔ ایک نئی جانماز کا انتظام کرو اور میت کو لے کر قبرستان چلو۔ ایوب امام صاحب کو لے کر ایک کونے میں گیا۔ جانے کیا ہوا کہ امام صاحب کے ماتھے پر شکنیں پھیل گئیں۔ میں نے دیکھا ایوب سب کی نظریں بچا کر دالان میں لٹکی شبراتی کی بنڈی کی جیبیں ٹٹول رہا ہے۔ اس نے جیبیں الٹ دیں۔ چاند تارہ بیڑی کا بنڈل اور ایک ماچس برآمد ہوئی اور کچھ نہیں تھا۔ خالی جیبیں بوڑھی گائے کے سوکھے تھنوں کی طرح لٹکی ہوئی تھیں۔

امام صاحب ایوب کو الگ بلا کر لے گئے۔ میں نے غور سے سنا۔ وہ اسے جنازے کی نماز کی اہمیت، تدفین میں عجلت اور قبر کے عذاب سے حفاظت وغیرہ کے بارے میں بہت سنجیدگی اور دردمندی کے ساتھ کچھ سمجھا رہے تھے۔ وہ آنکھیں نیچی کیے ان کی باتیں دھیان سے سنتا رہا۔

ایک لفظ نہیں بولا۔ یوں بھی اسے بولتے میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ اس کی آواز بھاری ہے۔ یا متوازن یا لڑکیوں کی طرح مہین۔ میں یہی سوچتا رہا۔ امام صاحب کا چہرہ اور لہجہ آہستہ آہستہ جہنم کی طرح سرخ اور تیز ہو رہا تھا۔ ایوب کے بھائی بہن ان تمام باتوں کو ایک گونہ احترام اور خوف کے ساتھ سنتے رہے۔ جب امام صاحب کو خیال آیا کہ دینی کتابوں کے وہ تمام حصے بیان کیے جا چکے جو اس موضوع پر انہیں یاد رہ گئے تھے تو وہ ایک عجیب سی بیزاری کے عالم میں ایوب کے سیاہ پڑتے چہرے کی طرف دیکھنے لگے کہ مغرب کا وقت ہو چکا تھا اور ایوب کی ماں آنگن میں کفن اوڑھے لیٹی تھی۔ ایوب کھڑا ہوا مایوسی کے عالم میں ہاتھ مل رہا تھا۔ تب میں نے تیز نظروں سے امام صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ سہم سے گئے کہ ان کا رات کا کھانا اور عید کے کپڑے ہمارے ہی گھر سے جاتے تھے۔ وہ میت کی چارپائی کی طرف لپکے۔

"حضرات! کلمہ پڑھتے ہوئے، میانہ روی سے قبرستان کی طرف چلیے۔ اول منزل میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ یہی حکم آیا ہے۔"

وہ سرہانے لگے۔ میں پائینتی لگا۔ راستے بھر 'اونہہ اونہہ' کی آوازیں کانوں میں آتی رہیں۔ بہت چاہا لیکن اندازہ نہیں ہو سکا کہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں۔ میرا ذہن نئی پرانی یادوں کو کھنگالتا رہا... دودھ کا خالی برتن، خالی صندوق میں بچے پیلے پرانے اخبار اور بنڈی کی خالی لٹکی ہوئی جیبیں۔ میں نے چچا کو، خود کو اور امام صاحب کو مفید، عالمانہ اور مشفقانہ باتیں کرتے سنا۔ دور اور قریب کے ماضی کی آوازوں کی تکرار، کلمے اور درود کو مدغم کرتا، آپس میں الجھاتا، نکالتا، سلجھاتا، سنتا اور محو کرتا ہوا میں آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ گرمیوں کی شامیں شفاف ہوتی ہیں۔ لیکن اس دن کے سوگ نے انہیں دھندلا کر دیا تھا کہ ہمارے کاندھوں پر ایک میت تھی اور اس میت کے بچے ہمارے دائیں بائیں کلمہ درود پڑھتے دھیمے دھیمے چل رہے تھے۔ گیہوں کے تازہ کٹے کھیتوں میں ڈنٹھلوں سے پیروں کو بچاتے ہوئے جب ہم قبرستان میں داخل ہوئے تو میں نے ایوب کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ اس نے میری طرف حیران سہمی سہمی نگاہوں سے دیکھا۔ مجھے 'اونہہ اونہہ' کی آوازیں پھر سنائی دیں۔ اس بار میں جان گیا۔ یہ آوازیں امام صاحب کے ہونٹوں سے نکل رہی تھیں جو بیزاری اور مایوسی کے ساتھ میت اٹھائے اپنے قدموں کو کھینچتے قبرستان میں داخل ہو رہے تھے۔ عشاء کے بعد جب رات شروع ہو چکی تھی تب میں گھر سے نکلا اور شبراتی کے گھر والوں سے نظریں بچا کر امام صاحب کو ایک نئی جانماز

دے آیا۔

☆☆☆

تار کا مضمون مختصر تھا۔

"ایوب اسپتال میں دم توڑ رہا ہے۔ آپ کی ضرورت ہے۔ فوراً آجائیے۔"

نیچے اس کے بڑے بھائی کا نام لکھا تھا۔ میں اسی وقت چل پڑا۔ گھر پہ ابا نے بتایا کہ وہ ٹرک ڈرائیور بن گیا تھا۔ برسات کا موسم، تنگ سڑکیں، موسلادھار بارش، سامنے سے آتے ٹرک کی تیز ہیڈ لائٹ اور ڈرائیور کی شراب نوشی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایوب کا ٹرک بری طرح حادثے کا شکار ہوا۔ حادثے کی جگہ سے لے کر وطن کے اسپتال تک سیروں خون بہہ گیا۔ درمیان میں کوئی طبی سہولت بھی میسر نہیں آئی۔

میں نے جلدی جلدی جیب میں بہت سے روپے رکھے اور اسپتال پہنچا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ اسپتال آبادی سے ہٹ کر ایک باغ کے کنارے بنا ہوا تھا۔ اسپتال میں ایوب کے بھائیوں اور سرکاری ڈاکٹر کے علاوہ میرا بچپن کا ساتھی ڈاکٹر نہال الدین بھی تھا جس پر مجھے زیادہ اعتقاد تھا۔ اسے دیکھ کر قدرے طمانیت کا احساس ہوا لیکن اس کا چہرہ بجھا بجھا تھا۔ مجھے بے چین دیکھ کر وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔

"نواڑ کے پلنگ کا رواج شروع ہوا تو ان لوگوں نے نواڑ کا کام شروع کر دیا۔ پھر دھیرے دھیرے شہروں کی دیکھا دیکھی سستے ڈبل بیڈ کا فیشن شروع ہوا تب یہ لوگ بالکل بے روزگار ہو گئے۔ ایوب نے مکتب میں بمشکل چار درجے پاس کئے۔ جب یہ سولہ برس کا ہو گیا تو اس نے مجھ سے عمر کا جھوٹا سرٹیفکٹ بنوا کر ٹرک کا لائسنس نکالا۔ تین چار برس تک اسی کام میں لگا رہا۔ ٹرک والوں کی زندگی کا تمہیں معلوم ہے۔ وقت پر کھانا نہ وقت پر سونا۔ ذہنی اذیتیں اور دن رات کا تشنج ایک طرف۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمزور ہو گیا۔ تیز بارش میں سامنے والے شرابی ڈرائیور نے ڈپر نہیں دیا۔ اس نے بچانے کی بہت کوشش کی لیکن کمزور ہاتھوں سے بھاری ٹرک کا اسٹیرنگ کتنا گھوم پاتا۔ سڑک کے کنارے شیشم کے ایک درخت سے ٹرک بری طرح ٹکرایا۔ سینے کی کوئی پسلی ایسی نہیں جو فریکچر نہ ہوئی ہو۔ اندر ہی اندر بہت خون بہا ہے جو کبھی کبھی قے کے ساتھ باہر آجاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسکا دل بھی بہت بیمار ہے" ڈاکٹر نہال بتاتے بتاتے تھک گیا۔

"بیمار ہے کیا مطلب؟" میں سمجھ نہیں پایا۔

"مطلب یہ کہ دل کا نچلا حصہ خون پمپ کرنے کی چوتھائی صلاحیت پر کام کر رہا ہے"

"یہ امراض تو امیر لوگوں کو ہوتے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اگر بچپن اور لڑکپن میں ڈھنگ کی غذا نہ ملے تو دل کی مچھلیاں اور وہ پٹھے آہستہ آہستہ کمزور ہو جاتے ہیں جو صاف خون کو بدن میں پھیلاتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ دوائیں بھی بدن کے ہر حصے میں اتنی سرعت سے نہیں پہنچ پاتیں جیسا ڈاکٹر چاہتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس مرض میں پھیپھڑوں کا متاثر ہونا لابدی ہو جاتا ہے۔ دل اور پھیپھڑے اگر ایک ساتھ کمزور ہو جائیں تو پھر معاملہ ...."

یہ کہہ کر وہ رک گیا اور میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ بے بسی اور ایک عجیب طرح کی برہمی کے احساس سے میرے دماغ کی ساری رگیں تن گئیں اور مجھے بہت واضح محسوس ہوا کہ میری آنکھوں کے دیدے پھول کر حلقوں کے قریب آگئے ہیں اور پورے بدن میں ایک کھنچاؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس حال میں دیکھ کر نہال نے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجھے ٹھنڈا پانی پلایا جو میں دو گھونٹ سے زیادہ نہیں پی سکا۔

"میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"چلو" نہال میرا ہاتھ پکڑ کر اس قصباتی اسپتال کے واحد وارڈ میں داخل ہوا جہاں ایک لالٹین جل رہی تھی جس کی لو ہوا کے جھونکوں سے بار بار بھڑک جاتی تھی۔ جب میری آنکھیں نیم روشن وارڈ میں کچھ مانوس ہوئیں تو میں نے دیکھا وہ لوہے کے پلنگ پر چت لیٹا ہے۔ اس کا پورا بدن پٹیوں سے جکڑا ہوا تھا جن پر جگہ جگہ خون چھلک آیا تھا۔ ایک ٹانگ چھت کے ہک کے سہارے لمبی سی رسی سے بندھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ صاف تھا صرف ماتھے پر دو پھاہے لگے ہوئے تھے۔ وہ دبلا اور سانولا ہو گیا تھا اور رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ وہ کیوں کہ پہلے سے ہی اندھیرے میں تھا اسلئے مجھے جلد پہچان گیا۔ میں اس کے قریب بڑھا، اس نے مجھے بغور دیکھا اور دھیمے سے تکلیف کے ساتھ مسکرایا۔

"تم مسکراؤ مت ایوب" اس کی تکلیف کے خیال سے بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور اپنے کھنچے ہوئے ہونٹ فوراً بھینچ لئے۔ اسپتال کے برابر کسی باغ میں کوئل بولی اور بولتی چلی گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر بول نہیں پا رہا تھا۔ اچانک

مجھے خیال آیا کہ میں نے آج تک اس کی آواز نہیں سنی ہے۔ میں نے اپنا چہرہ اس کے قریب کر دیا۔ لالٹین کی زرد روشنی میں ہر چیز کی پرچھائیں بڑی اور مہیب لگ رہی تھی۔ میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ پھر کچھ بولنا چاہتا تھا مگر شاید سانس کی تکلیف کی وجہ سے بول نہیں پا رہا تھا۔ نہ بول پانے کی ندامت اس کے چہرے پر ایک تکلیف دہ مسکراہٹ کے طور پر جم گئی۔ میں نے زخم بچا کر اس کے ماتھے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرا۔ انگلیوں کے لمس میں چھپی شفقت کے احساس سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنی سہمی ہوئی خالی خالی آنکھیں کھولیں۔ اس کی خالی خالی آنکھیں دیکھ کر میں نے سوچا کہ میں پڑھ لکھ کر اب بڑا آدمی بن چکا ہوں۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ میں ماضی کی مختلف اشیاء اور واقعات کو حال کی مختلف اشیاء اور معاملات سے جوڑ کر بامعنی کلیے بنا سکتا ہوں کہ میں نے ادب، تاریخ، سیاست، سماجیات اور تہذیب پر بے شمار کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ ایوب سے متعلق ماضی کے تمام معاملات ایک نظر میں سامنے آگئے۔ دودھ کا خالی برتن، کپڑوں کا خالی صندوق اور بنڈی کی خالی جیبیں مجھ سے سرگوشیوں میں کہہ رہی تھیں کہ ساری مفید، عالمانہ اور مشفقانہ باتیں سر آنکھوں پر لیکن وہ سب ہمارے بس کی باتیں نہیں ہیں۔ وہ سب.........

اس کی آنکھیں پھر آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔ ڈاکٹر نہال نے تیزی سے بڑھ کر اس کی نبض سنبھالی۔ پھر اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ سینے پر جکڑی ہوئی پٹیوں میں جگہ بنا کر دل کی دھڑکن سنی۔ ڈاکٹر نہال کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ میں نے بے چینی سے نہال کی طرف دیکھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور وارڈ کے کونے میں لے جا کر بولا۔

"دل کی رفتار تیس ہو گئی ہے جو عام حالات میں ستر اور اسی کے درمیان ہوتی ہے۔ دل کے مختلف حصوں کی آوازیں بھی بے ترتیب ہونے لگی ہیں۔ اب اس کا وقت قریب آگیا ہے اس وقت کی دعا پڑھ دو۔"

میں اس کے پلنگ کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور یٰسین شریف آہستہ آہستہ پڑھنے لگا۔ سرکاری ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔ نہال سے بولا۔

"آکسیجن کا سلنڈر مل جائے گا مگر ضمانت کے طور پر پانچ سو روپے جمع کرنے ہوں گے"

ایوب کی آنکھیں کھلیں۔ اس نے اپنے چہرے سے بمشکل دیوار پر ٹنگے اپنے خون آلود لباس کی طرف اشارہ کیا۔ میں کچھ کچھ سمجھ گیا۔ میں نے اپنی جیب میں جاتا اپنا ہاتھ روکا اور اس

کے لباس کی جیب سے ساری رقم نکال لی۔ یہ سات سو سے زیادہ تھے۔ میں نے جان بوجھ کر باآوازِ بلند کہا۔

"سلنڈر کی ضمانت میں پانچ سو روپے جائیں گے جب کہ ایوب کے پاس سات سو روپے سے زیادہ ہیں۔"

میرے ان جملوں سے ان کے چہرے پر چوٹوں کی تکلیف کے باوجود اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے رقم سرکاری ڈاکٹر کے حوالے کی اور یٰسین شریف جہاں سے چھوڑی تھی وہیں سے شروع کر دی۔ اس کی آنکھیں پھر آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔ نیم وا آنکھوں میں اب صرف سفیدی نظر آ رہی تھی۔

"ہے تو تکلیف دہ بات لیکن یہ کام تم ہی کر سکتے ہو۔ ایوب سے کہو کلمہ پڑھے۔" ڈاکٹر نہال نے گلے سے اتار کر آلہ میز پر رکھ دیا۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی ہے۔ میں اس کے قریب گیا۔ اس کی پیشانی پر دیر تک بوسہ دیا۔ ہونٹوں کی حرارت سے اس کی آنکھیں کھلیں۔ میں نے دل پر جبر کر کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس سے کہا۔

"میں سورۂ ملک پڑھ رہا ہوں۔ اس سے قبر کا عذاب نہیں ہوتا۔ میں اردو میں مطلب بھی بتاتا چلوں گا ایوب"۔

وہ آنکھیں کھولے ٹکر ٹکر میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے سورۂ ملک پڑھنا شروع کیا۔

"وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جس نے موت اور زندگی پیدا کی کہ تمہاری جانچ ہو۔ تم میں سے کس کا کام زیادہ اچھا ہے۔"

"بے شک وہ جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں، ان کے لئے بخشش اور بڑا ثواب ہے اور تم اپنی بات آہستہ کہو یا آواز سے۔ وہ تو دلوں کی جانتا ہے۔"

"وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لئے کان اور آنکھ اور دل بنائے مگر تم کتنے ناشکرے ہو۔"

وہ مستقل حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ دھیمے سے مسکرایا اور ہاتھ سے اپنی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا کہ اسے رسی کے شکنجے سے آزاد کر دیا جائے۔ میں نے ڈاکٹر نہال کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اجازت دے دی۔ میں نے آہستگی سے اس کی ٹانگ نکال کر پلنگ پر رکھ دی۔ اس نے ایک تیز سسکاری روکی اور پھر چپکے سے مسکرایا۔ میں

آہستہ سے اس سے مخاطب ہوا۔

"ایوب! تم جانتے ہو جو دنیا میں آتا ہے اسے جانا ہوتا ہے۔ مجھے بھی مرنا ہوگا اور تمہیں بھی۔ تمہیں معلوم ہے کہ اللہ نے اپنے اچھے بندوں کے لئے جنت بنائی ہے۔ جنت میں جگہ جگہ باغات ہیں۔ زمرد اور پکھراج کے محل ہیں۔ وہاں نہریں ہیں جن میں دودھ اور شہد بہتا ہے۔"

میں نے آخری بار یٰسین شریف کا ورد کیا

"اور ہم نے اس میں باغ بنائے کھجوروں اور انگوروں کے۔ اور ہم نے اس میں کچھ چشمے بہائے کہ اس کے پھلوں میں سے کھائیں۔"

"ان کے لئے اس میں میوہ ہے اور ان کے لئے ہے اس میں جو مانگیں۔"

اس کا تنفس بگڑ چکا تھا اور سانسیں بہت بے ترتیبی کے ساتھ آ رہی تھیں۔ یہ رات کا تیسرا پہر تھا اور مجھے بتایا گیا تھا کہ رات کا تیسرا پہر دعاؤں کی قبولیت کے لئے بہت اچھا ہوتا ہے۔

"ایوب" میں نے اس پر جھکتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "ایوب! تم ہاتھ اٹھاؤ دعا کے انداز میں۔ اپنے لئے مغفرت کی دعا کرو۔ تم دیکھنا تمہاری روح بدن سے نکلتے ہی جنت میں پہنچ جائے گی جہاں دودھ اور شہد......"

اس نے کولہوں کے پاس، ہتھیلیوں کے بل پڑے اپنے کمزور ہاتھ اٹھائے اور بجائے اس کے کہ ہتھیلیاں اپنے چہرے کی طرف موڑ کر دعا کرتا، ہتھیلیاں میرے آگے کر دیں۔ خالی، سوکھی اور زرد ہتھیلیاں میرے چہرے کے سامنے کانپنے لگیں۔ ان آخری لمحوں میں اسے سہارا دینے کے لئے میں نے جنت کی آسائشوں کا ذکر پھر شروع کیا ہی تھا کہ اس نے بدقت آنکھیں کھولیں اور بہت واضح انداز میں صرف ایک لفظ کہا۔

"اونہہ"

اس کی خالی ہتھیلیاں آہستہ سے اس کے بدن کے پاس گریں اور آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔

○○

آخری موڑ پر

ریل رات کے دو بجے آنے والی تھی اور پلیٹ فارم تقریباً سنسان ہو چکا تھا۔ سراج چاروں کا انتظار کرتے کرتے بیزار ہو چکا تھا۔ اس نے چوتھی مرتبہ گھڑی دیکھی۔ ابھی وقت تھا۔

سردی بہت شدید تھی اور کہرا پلیٹ فارم کے فولادی شیڈ میں سرمئی شامیانے کی طرح تنا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم کی بتیاں موم کی شمعوں سے زیادہ اجالا نہیں پھیلا رہی تھیں۔ ان کی روشنی سراج تک آتے آتے کہرے میں گھل مل کر اور زیادہ مدھم ہو جاتی تھی۔ برابر سے ایک شخص لمبا کوٹ پہنے ہاتھ میں چورُخی لالٹین لئے خاموشی سے نکلا۔ سراج اس کی پشت کی طرف دیر تک دیکھتا رہا تبھی اسے مال گودام سے تین سایے برآمد ہوتے نظر آئے۔ وہ ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے اور اسی کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ سخت سردی اور ایک انجانے خوف سے اس کے

ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ان سایوں نے قریب آکر اپنے اپنے مفلر کھولے اور پھر چاروں ہنسنے لگے۔ وہ تینوں فاتحانہ انداز میں اور سراج شرمندہ ہو کر...... اس نے جلدی سے اپنے خوف کو دفع کیا اور نارمل آواز بنا کر بولا۔

"میں دور سے غور کر رہا تھا کہ تم لوگ تو آرہے ہو لیکن رافعہ تم میں نہیں ہے۔ رافعہ کہاں ہے؟

"ہاہا.. ہاہا... جیسے تم ہم سے ڈرے ہی نہیں۔ کسی اور کو پاگل بنانا۔"

کسی نے پیچھے سے کندھے پر دھیمے سے ہاتھ رکھا۔ایک نرم نسوانی آواز سنائی دی۔

"میں یہاں ہوں بہادرِ ملت۔ بندی مین گیٹ سے داخل ہوئی اور پہلے سیدھے ویٹنگ روم میں گئی جہاں چچا صاحب ایک کوچ پر آرام فرما ہیں اور ہم پانچوں کی عافیت و آخرت کے بارے میں فکر مندی اور اضطراب کا بآوازِ بلند اظہار کر رہے ہیں۔"

"کیوں... کیوں۔ کیا وہ ناراض ہیں۔ تم اتنی مشکل اردو کیوں بولتی ہو؟" سراج بولا

"وہ بیچارے بارہ بجے سے آ کر ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ چار پیالی چائے پی چکے ہیں اور اتنی ہی بار باتھ روم جا چکے ہیں۔ اور ہر بار انہیں موٹے کمبل سے نکلنا پڑتا ہے۔ اسٹیشن پر ہم میں سے کسی نے ان کی خیریت تک نہیں معلوم کی۔"

"اسٹیشن پر تھا ہی کون سراج کے علاوہ۔" تینوں سابق ڈاکوؤں نے توجیہہ پیش کی۔ "سراج کو جا کر ان کے پاس بیٹھنا چاہئے تھا۔ ہم تو خود ایک ہی رکشے میں بیٹھے، سردی کھاتے، اللہ اللہ کرتے چلے آرہے ہیں۔"

"تم لوگوں کے یہی احوال رہے تو" رافعہ شرارت سے مسکرائی۔

"تو مجھے لگتا ہے چچا صاحب صبح ضلع دفتر میں جا کر سب سے پہلا اعلان یہی کریں گے کہ وہ اپنی وصیت رجسٹرڈ کرانے نہیں، کینسل کرانے آئے ہیں۔"

"بدفال نہ نکالو رافعہ۔ کتنے عرصے بعد تو بڑے میاں راضی ہوئے ہیں۔ یعنی اس وقت جب انہیں یقینِ کامل ہو گیا کہ ان کا دوسرا پیر بھی قبر کی طرف، ان کی تمام کوششوں کے باوجود، کھسکتا چلا جا رہا ہے۔" ڈاکوؤں میں کا ایک بولا۔

"چلو مرکری کے نیچے چلیں۔ وہاں روشنی بھی ہے گرمی بھی۔ پھر چچا صاحب کے پاس چل کر بیٹھیں گے۔ ریل میں ابھی بھی آدھا گھنٹہ ہے۔ آج ہی کم بخت کو لیٹ ہونا تھا۔" سراج

نے آخری جملہ بڑبڑاتے ہوئے ادا کیا۔

جب وہ مرکری کے نیچے کھڑے ہوئے تب ان کے چہرے واضح ہوئے۔

سراج دراز قد کچھ کچھ فربہ نوجوانی میں قدم رکھتا ہوا۔ زبیر، عامر اور سلیمان سرخ و سفید ہنس مکھ چہرے والے نوجوان جو سراج سے کچھ بڑی عمر کے لگ رہے تھے۔ رافعہ کتابی چہرے اور بڑی بڑی آنکھوں والی ہمہ وقت مسکراتی ہوئی نرم نرم سی لڑکی جو عمر میں شاید ان میں سب سے چھوٹی تھی۔ یہ سب آپس میں چچازاد بھائی بہن تھے۔ ویٹنگ روم میں لیٹے چچا صاحب بے اولاد تھے۔ وہ اپنی جائیداد اپنے بھتیجوں اور بھتیجی کو وصیت کے ذریعہ دینا چاہتے تھے لیکن اس وقت کا انتظار کر رہے تھے جب زیادہ دن جینے کی امید نہ باقی رہے۔

زبیر، عامر اور سلیمان تینوں مل کر سراج اور رافعہ سے مشورہ کرتے رہے کہ چچا صاحب کا سامنا کیسے کیا جائے۔ دراصل انہوں نے چچا صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ٹرین کے صحیح وقت یعنی بارہ بجے انہیں اُن کے گھر سے لے کر اسٹیشن آجائیں گے۔ فون پر وقت معلوم کیا تو علم ہوا کہ ٹرین دو گھنٹے تاخیر سے چل رہی ہے۔ وہ مطمئن ہو گئے۔ لیکن چچا ساڑھے گیارہ بجے انتظار کرتے کرتے جب بے چین ہو گئے تو اکیلے ہی اسٹیشن آکر، ٹکٹ خرید کر ویٹنگ روم میں لیٹ گئے۔

اب تینوں چچا کے سامنے کھڑے تھے۔ سراج اور رافعہ ان کے پیچھے شرمندہ شرمندہ سے کھڑے تھے۔ وہ تینوں اب تک ایک شاندار داستان تخلیق کر چکے تھے۔

چچا صاحب کوچ کے سرہانے سے پیٹھ لگائے کمبل لپیٹے سر جھکائے ناراض ناراض سے بیٹھے تھے۔ ان کا بریف کیس ان کی بغل میں دبا ہوا تھا۔

"السلام علیکم چچا صاحب" تینوں نے بیک وقت سلام کیا۔

چچا صاحب ایک لمحے کو چپ رہے۔ پھر دھیمے سے بولے۔ "وعلیکم السلام".... پھر خاموشی کا اذیت ناک وقفہ۔

انہوں نے خاموشی خود ہی توڑی۔

"آگئے آپ حضرات۔ بڑی جلدی کی۔"

"ارے چچا صاحب آپ کو معلوم نہیں ہوا شاید" زبیر نے کمان اپنے ہاتھ میں لی۔

"جیسے ہی ہم تینوں آپ کے گھر کی طرف چلے تو راستے میں اندھیری سڑک پر کچھ شور

سا سنائی دیا۔ کچھ دوشیزاؤں کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ ہم لوگ بھاگ کر ادھر گئے تو دیکھا کہ تین چار غنڈوں نے رکشے والے کو باندھ رکھا ہے اوران ماں بیٹی کے زیور اتروار ہے ہیں۔ ہم تینوں انہیں للکار کر آگے بڑھے۔ بڑی پٹائی کی۔ وہ تینوں ڈر کے مارے بھاگ گئے۔ ہم نے رکشے والے کو آزاد کیااور ان ماں بیٹی کوان کے گھر تک چھوڑ کر آئے۔ اس لئے اتنی دیر لگی چچاصاحب۔"

بوڑھے چچا صاحب نے تینوں کی جانب مشکوک نظروں سے دیکھا۔ پھر پیچھے کھڑے سراج اور رافعہ سے پوچھا۔

"آپ کااس سنگین معاملے میں کیاتعاون رہا۔"

"چچاصاحب! میں تو پہلے سے اسٹیشن پر آگیا تھالیکن ان تینوں کاانتظار کررہا تھا تاکہ ہم چاروں آپ کے سامنے ایک ساتھ آئیں۔"

"اور آپ؟انہوں نے رافعہ کی طرف دیکھا۔

"چچاصاحب! میں نے فون پر ریل کاوقت معلوم کرلیا تھا۔ میں نہ سراج کی طرح پہلے سے آئی نہ ان تینوں کی طرح مال گودام کے شارٹ کٹ سے آئی۔ مجھے عبدل ڈرائیور چھوڑ گیا تھا۔ میں اطمینان سے مین گیٹ سے آئی۔ کچھ دیر ان سب کا انتظار کیا۔ سراج اندھیرے میں کھڑے انتظار کرہے تھے۔ میں نہیں دیکھ سکی۔ یہ تینوں مال گودام کے راستے سے داخل ہوئے۔ میں اُس سے پہلے ہی آکر آپ کی خیریت معلوم کرچکی تھی۔ ویٹنگ روم سے باہر نکلی توان چاروں کی آوازوں سے اندازہ کیا کہ یہ لوگ آچکے ہیں۔ باہر بہت کہرا اور سردی ہے چچا صاحب۔" رافیہ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں بھینچ لیں۔

"ہوں..." چچا ابھی بھی یقین اور گمان کے درمیان کسی اونچی نیچی چٹان پر کھڑے تھے۔

"پہلی بات تو یہ کہ اردو ذرا احتیاط سے بولا کیجئے۔ دوشیزہ کنواری لڑکی کو کہتے ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ غنڈوں کو بھگانے اور خواتین کو گھر پہنچانے میں بمشکل بیس منٹ لگے ہوں گے۔ آپ تینوں تو ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد آرہے ہیں۔"

تینوں نے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا۔ یہ سوال غیر متوقع تھالیکن داستان گو اپنے فن کی آبرو تھے۔

اس بار سلیمان کی باری تھی۔ اس نے خاصا تخلیقی ذہن پایا تھا۔

"ہم آپ کو بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ دراصل جب ہم ان دوشیزاؤں۔۔۔۔ مطلب یہ کہ ان عورتوں کو چھوڑ کو واپس آ رہے تھے تو قبرستان کے قریب ہم نے کسی کو زور زور سے ڈانٹتے ہوئے سنا۔ ہم تینوں خوفزدہ ہوئے بغیر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے پکڑے جھاڑیوں کے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے۔ وہاں ہم نے اک عجیب منظر دیکھا۔ وہ منظر اپنی جزئیات کے ساتھ مدتوں یاد رہے گا۔ ہا۔ کیا منظر تھا۔ نہایت خوف ناک۔ سرجری والے بڑے ڈاکٹر صاحب شیروانی ٹوپی پہنے ہاتھ میں چھڑی لئے کھڑے تھے۔ ان کی سائیکل برابر میں کھڑی تھی اور وہیں ہاتھ میں چاقو لئے دو چور کھڑے تھے۔ خوف ناک چہرے والے۔ درندہ صفت۔۔۔۔ نقاب پوش۔"

"واللہ؟" چچا صاحب کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"جی ہاں چچا صاحب ہم کوئی آپ سے جھوٹ بولیں گے۔ البتہ اب ان سے واپسی پر کچھ نہ پوچھئے گا۔ وہ شرمندہ ہو جائیں گے۔ نیک انسان ہیں نا۔"

"ہاں۔ ہے تو بات شرمندگی کی۔ مگر آگے کیا ہوا؟"

"آگے کیا ہونا تھا" اب سلیمان کی آواز میں اعتماد کھنکھنانے لگا تھا۔ کھرج کے لہجے میں گویا ہوا۔

"ایک چور نے چاقو دکھا کر ان سے ان کی سائیکل چھین لی حالاں کہ وہ مستقل یہ آرگومنٹ دیتے رہے کہ اگر آپ لوگ سائیکل لے جائیں گے تو اتنی رات اور سردی میں وہ پیدل دو میل دور اپنے گھر تک کیسے پہنچیں گے۔ لیکن چوروں نے ان کی ایک بات نہیں مانی۔

پھر چوروں نے ان کو گالی دے کر پوچھا۔

"جیب میں کتنے روپے ہیں۔؟"

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ لوگ شائستگی کا دامن نہ چھوڑیں اور ذرا تمیز سے مخاطب کریں۔

اس پر چوروں نے کہا کہ "اے ڈاکٹر سیدھی طرح سے روپے نکال کر دے دے نہیں تو ابھی تیری تمیز اور قمیص دونوں پھاڑ دیں گے۔"

"استغفر اللہ"۔ چچا صاحب آنکھیں پھیلائے انہیں دیکھتے ہوئے دھیمے سے بڑبڑائے۔

"پھر"؟ چچا صاحب نے بریف کیس ایک طرف رکھ کر خود کو کمبل میں اچھی طرح لپیٹا۔

"ہوتا کیا چچا صاحب۔ ڈاکٹر صاحب کو شیروانی کی جیب سے ساری نقدی نکال کر دینا پڑی۔ تین سو روپے تھے۔ میں نے اپنی آنکھ سے سو سو کے تین نوٹ دیکھے تھے۔" سلیمان سانس لینے کو رکا۔ رافعہ اور سراج نے دوسری طرف منہ پھیر لیا تھا۔

"اب چوروں نے ڈنڈے سے اشارہ کر کے کہا کہ ڈاکٹر صاحب تمہارے پاس تو اور بھی شیروانیاں ہوں گی۔ یہ شیروانی اتار کر ہمیں دے دو۔" اس پر ڈاکٹر صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولے۔ دیکھئے حضرات۔ آپ کو علم ہونا چاہئے کہ میں آج تک گھر سے باہر کبھی بغیر شیروانی نہیں نکلا ہوں۔ یہ میرے واسطے بڑا ذلت آمیز معرکہ ہو گا۔ اس بات پر چور ہنسنے لگے۔ اتنی زور سے ہنسے کہ ڈاکٹر صاحب ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ پھر ان میں کا ایک بولا کہ رات اندھیری ہے۔ سڑک پر سناٹا ہے۔ دور دور تک کوئی آدمی ہے نہ آدم زاد۔ تم کو ذلت کیوں کر محسوس ہو گی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب بولے کہ ذلت کے لئے اندھیرا اجالا یا تنہائی اور آبادی ضروری نہیں ہیں۔ ذلت ایک احساس کا نام ہے۔"

تب وہ چور بولا کہ تم ڈاکٹر ہو یا اردو کے رائٹر۔ شاعروں جیسی باتیں کیوں کرتے ہو۔ شیروانی اتارو۔"

"چچا صاحب" سلیمان ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ "ناچار ڈاکٹر صاحب کو شیروانی اتار کر دینا پڑی۔"

"پھر... ؟ چچا صاحب کا منہ رنج کی وجہ سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"پھر ایک عجیب بات ہوئی چچا صاحب! ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا۔ حضرات! آپ نے مجھے تنہا اور بے آسرا دیکھ کر روکا میں رک گیا۔ آپ نے دشنام سے کام لیا۔ میں چپ رہا۔ آپ نے میرے سفر کی رفیق سائیکل کو مجھ سے طلب کیا۔ میں نے بسر و چشم آپ کے حوالے کر دی۔ آپ نے نقد مال کا سوال کیا۔ میں اس سے بھی دست بردار ہوا۔ اس کے بعد بھی آپ کی حسرت ہوا و ہوس پوری نہیں ہوئی اور آپ نے میرا لباس بھی اتروا لیا۔ میں نے بادل ناخواستہ شیروانی بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دی۔ اب گیارہ گیا ہے۔ اگر اجازت مرحمت ہو تو میں یہاں سے منہ کالا کروں۔"

"ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر رکے تو چوروں نے کہا۔ جائیے۔ ڈاکٹر السلام علیکم اور خدا حافظ

کہہ کر آگے بڑھے ہی تھے کہ پیچھے سے ایک چور نے ان کے دو تین ڈنڈے خوب کس کس کے مارے۔ ڈاکٹر صاحب نے بے حد بے چارگی کے عالم میں ان کی طرف دیکھ کر کہا" جناب والا۔ آپ کی یہ حرکت نہایت نازیبا ہے۔ آپ جیسا جیسا کہتے گئے میں کرتا گیا۔ آپ جو جو چیز مانگتے گئے میں دیتا گیا۔ آخر ڈنڈے مارنے کی کیا ضرورت تھی۔ تب ان میں کا بڑا چور آگے بڑھا اور ڈاکٹر صاحب کے مقابل جا کے کھڑا ہو کر بولا۔

"سنو ڈاکٹر صاحب ہم لوگ چور ہیں کوئی بھک منگے نہیں ہیں کہ ہم مانگتے جائیں اور آپ دیتے جائیں۔ آخر ہماری بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔ ہم محنت کی کمائی کھانا چاہتے ہیں، بھیک کی نہیں۔ سمجھے۔؟"

رافعہ اور سراج منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانسی کا بہانہ کر کے کنکھارتے ہوئے باہر پلیٹ فارم پر آئے اور ہنسی کے مارے دوہرے ہو گئے۔

چچا صاحب حیرت اور غم کی تصویر بنے منہ کھولے دیر تک ان تینوں کو دیکھتے رہے۔ اور پھر سر جھکا لیا۔ دیر کے بعد بولے۔

"تم لوگ نوجوان تھے۔ وہیں جھاڑیوں کے پیچھے کھڑے رہے۔ تم ان کم بخت ذلیل چوروں کو مار کر نہیں بھگا سکتے تھے؟"

اب عامر کی باری تھی۔

"دراصل چچا صاحب! ان لوگوں کے ہاتھوں میں یہ بڑے بڑے چاقو تھے جو چاندنی میں خوب چمک رہے تھے۔ غالباً رام پوری تھے۔ دوسرے ہم کو لوگوں کو یہ بھی احساس تھا کہ ڈاکٹر صاحب ہم لوگوں کو دیکھ کر شرمندہ ہوں گے۔"

اس جواب سے چچا صاحب کے چہرے پر اطمینان آیا۔ تھوڑے توقف کے بعد چچا صاحب نے پوچھا۔ "رام پوری چاقو چاندنی میں چمک رہے تھے؟ لیکن آج تو اتنا کہرہ ہے کہ چاند تک نظر نہیں آیا۔"

داستان گو نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

"چچا صاحب۔ قبرستان کے پاس والا علاقہ خوب کھلا کھلا ہے۔ وہاں خوب ہوا چل رہی تھی اس لئے کہرہ ہٹ گیا تھا کہ رام پوری چاقو خوب..."

جملہ کچھ اچھا نہیں بنا تھا اس لئے اس موقع پر اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

قدرت بھی داستان گو کے ساتھ تھی کیوں کہ ریل پلیٹ فارم میں داخل ہو چکی تھی۔

پانچوں نے چچا صاحب کی مدد کی۔ سب کے سب ایک نسبتاً خالی ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے جس کی نشستیں برف ہو رہی تھیں۔

"ضلع کے صدر مقام تک کتنے بجے پہنچے گی ٹرین"؟ رافعہ نے گود میں اپنے ہاتھ چھپا کر بدن سکوڑتے ہوئے پوچھا۔

"دو گھنٹے لیٹ ہے تو صبح چار ساڑھے چار بجے تک پہنچے گی" سراج نے جواب دیا۔

تینوں داستان گو حضرات آپس میں چپک کر بیٹھ گئے تھے اور سینے پر سر ڈال کر سونے کی تیاری میں مگن تھے۔

چچا صاحب نے رافعہ کو جاڑے میں سکڑتے دیکھا تو اپنے کمبل میں اسے بھی لپیٹ لیا۔ تھوڑی دیر بعد رافعہ ان کے سینے سے اور وہ سیٹ کی پشت سے سر ٹیک کر اونگھنے لگے۔ سراج کو ایسا لگا جیسے وہ اکیلا رہ گیا ہو۔ ڈبے کی مدھم روشنی میں اسے دیکھنے لائق کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ رافعہ کا آدھا سر، ہاتھ پاؤں سب کمبل میں چھپے ہوئے تھے۔ ویسے بھی رافعہ نے بند جوتے پہن رکھے تھے۔

"صدر مقام ریل کے اسٹیشن سے بہت دور ہے۔" چچا صاحب جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہوں۔

"نہیں۔ بس آٹھ کلو میٹر ہے۔" رافعہ نے اونگھتے میں جواب دیا

"آٹھ کلو میٹر کیا کم ہوتے ہیں۔ ایں رافعہ؟" سراج کو لگا جیسے بیزاری کے اندھیرے میں کہیں سے کوئی کرن آ گئی ہو۔

رافعہ کچھ لمحے چپ رہی۔ پھر اس نے ملگجے اندھیرے میں اپنا طباق سا چہرہ نکالا۔ جس نے وہ جملہ کہا تھا اسے کچھ دیر تک دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔

"آٹھ کلو میٹر ہوں کہ اسی کلو میٹر۔ پیدل تھوڑے ہی جانا ہے۔ اسٹیشن سے صدر مقام تک صبح ہی صبح بسیں چلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اسٹیشن پر سینکڑوں مسافر اترتا ہے۔ کوئی کاروبار کے کام میں، کوئی عدالت کے چکر میں، کوئی اسپتال کے لئے۔"

اس کے اتنے لمبے جملے پر سراج کا دل خوش ہوا۔ اسے یہ سوچ کر افسوس ہوا کہ ڈبے کے نیم تاریک ماحول میں رافعہ اس کے چہرے کی خوشی نہیں دیکھ سکتی۔

"پہلی بس کتنے بجے جاتی ہے سراج" رافعہ نے پوچھا۔

"پانچ بجے" سراج بولا۔ پھر یکایک کچھ سوچ کر اس نے بات کو آگے بڑھایا۔ "بڑی بھیڑ ہوتی ہے پہلی بس پر۔ سب کو صدر مقام پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے۔ بس کے اتنے زیادہ اسٹاپ ہیں کہ ایک جگہ سے چلتے ہی دوسرے اسٹاپ پر رک جاتی ہے۔ ہم لوگوں کو بھی پہلی ہی بس پکڑنا ہوگی ورنہ کچہری کے کاتب لوگ بیع ناموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ پانچ پانچ چھے چھے صفحے کا ایک ایک بیعنامہ ہوتا ہے۔ کوئی کوئی تو بیس بیس صفحے کا اگر زمین میں جھگڑے مقدمے زیادہ ہوں۔ ہم لوگ جلدی سے پہنچ کر اپنا کام اول وقت میں کرا لیں گے تاکہ چچا صاحب آرام سے دوپہر تک گھر واپس آسکیں۔ کتنے بیمار اور کمزور ہو گئے ہیں۔" اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ جملہ ختم کرے لیکن مجبوری تھی۔ فی الحال بولنے کے لئے اس سے زیادہ کچھ تھا ہی نہیں۔

چچا صاحب نے اس کی باتیں سن لی تھیں۔ بولے

"خدا کا شکر ہے کہ تم لوگوں کو میرا اتنا خیال ہے۔ ارے میاں! کیا ہمارا آرام۔ اور کیا ہماری تکلیف۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ بیٹا اب تو ہم پکا پتہ ہیں۔ اللہ ایمان پر خاتمہ بخیر کرے۔ مر جائیں تو اپنے کاندھوں پر لاد کر بزرگوں کی ہڑواڑ میں گاڑ آنا۔"

اتنے میں گاڑی اگلے اسٹیشن پر رکی۔ یہ نسبتاً بڑا شہر تھا۔ بہت سے مسافر ڈبے میں گھس آئے۔ جس کا ایک فوری فائدہ یہ ہوا کہ سردی کا احساس کچھ کم ہو گیا۔

زیادہ تر جان پہچان کے لوگ تھے۔ چچا صاحب سے تقریباً ہر آدمی کی سلام دعا ہوئی۔

ہمارے چچا صاحب کتنے مقبول انسان ہیں۔ یہ اپنے مرنے کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ اس کا دل بھر آیا۔ رافعہ نے چچا صاحب کا ہاتھ پکڑ کر روٹھے روٹھے انداز سے کہا۔

"آپ موت وزیست کی باتیں مت کیا کیجئے چچا صاحب۔ میرے دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔"

اسے منشی نصیر الدین نے اردو اچھی پڑھائی ہے۔ سراج نے سوچا۔ کاش ابا نے ہمارے واسطے بھی ان کی ٹیوشن کرادی ہوتی نہیں تو ہم اور رافعہ ساتھ ساتھ بھی پڑھ سکتے تھے۔

چچا صاحب کو اپنی بھتیجی کی شفقت آمیز نصیحت بہت اچھی لگی۔ لیکن نہ جانے انہیں کس بات کا خیال آیا کہ وہ چپ سے ہو گئے۔ دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔

"کس کے مرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔" وکیل رام پرشاد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

لیجئے۔ ہمارے چچا صاحب کے مرنے کی باتیں ہو رہی ہیں اور یہ مسکرا رہے ہیں۔ سراج نے سوچا۔ گاڑی چل پڑی۔

"نہیں۔ نہیں۔ دراصل اک عام بات کا ذکر ہو رہا تھا کہ اللہ جب سکون واطمینان کے ساتھ ایمان پر خاتمہ کرے تو گھر کے بچے اپنے بڑوں کو اپنے کاندھے پر لے جا کر بزرگوں کے قبرستان میں دفن کر آئیں۔"

چچا صاحب نے اصل واقعے سے باخبر کیا۔

"ارے میاں صاحب۔ اس بات کا دھیان تو جانور تک رکھتے ہیں"؟

چچا صاحب سے بھی زیادہ بوڑھے پنڈت جی بولے۔

لیکن شیئر بروکر شیام سندر نے ناگواری کے ساتھ پنڈت جی کی طرف دیکھا۔ اس کی ناگواری کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ دل ہی دل میں کوئی پیچیدہ حساب لگا رہا تھا جس میں پنڈت جی کی آواز نے رخنہ ڈال دیا تھا۔

"اس بات کے ثبوت میں آپ کوئی مثال دے سکتے ہیں۔" سراج نے پنڈت جی کی طرف ادب سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ رافعہ کچھ سوچ کر مسکرائی۔

"جتنے بھلے مانس نیک وچار والے لوگ ہیں اگر یاد کریں تو انہیں میری بات کے ثبوت کے طور پر کوئی نہ کوئی واقعہ یاد آجائے گا۔" پنڈت جی نے اپنی مشکل آسان کر لی۔

سب لوگ اندر ہی اندر سنبھل کر بیٹھ گئے کیوں کہ اب وہ بھلے مانس نیک وچار والے لوگ تھے۔ ان تینوں کی نیند بھی اس نئے چیلنج کو سن کر ٹوٹ گئی تھی۔ وہ لوگ جلدی جلدی پلکیں مار مار کر نیند کو بھگانے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ لیکن جانوروں کے میدان کا انہیں کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ زبیر، عامر، اور سلمان جان توڑ کوشش کرنے لگے کہ انہیں کوئی ایسا واقعہ یاد آجائے۔ سچ مچ کا واقعہ نہیں بھی یاد آئے تو کوئی بات نہیں، بس ذرا سا سرا مل جائے۔ آج تو مشق بھی اچھی کی تھی۔ لیکن اس وقت قسمت مہربان نہیں تھی۔ زبیر کو جب کوئی واقعہ یاد نہیں آیا تو اسے کچھ اور یاد آگیا۔ اس نے اپنے پاس بیٹھے عامر سے دھیمے سے پوچھا۔

"چچا صاحب کے پاس کیش کتنا ہو گا؟"

"کیش تو تھوڑا ہی رکھتے ہوں گے۔ بینک میں البتہ ایف ڈی آر کافی ہیں۔"

"اماں اسے بھی کیش ہی سمجھا کرو عامر۔"

شیام سندر نے صرف ایف ڈی آر کا لفظ سنا۔

"بینک میں ایف ڈی آر رکھنے سے کیا فائدہ۔ آج کل تو جو پیسہ ہو، اس کے شیئر خرید لینا چاہئے۔ اس وقت شیئر بازار کا انڈیکس خوب اونچائی پر ہے۔"

تبھی ایک دراز قد آدمی، جو اب تک چپ چاپ بیٹھا تھا، بولا۔

"میں نے تو تنزانیہ میں جتنا پیسہ کمایا اسکا آدھا ہندوستان کے شیئروں میں لگایا۔ پر زیادہ تر شیئر ڈوب گئے۔ نقصان ہی نقصان اٹھایا۔"

"آپ کو" شیام سندر چہک کر بولے "آپ کو ڈھنگ کا مشورہ دینے والا کوئی نہیں ملا ہوگا۔ بس اخبار میں شیئروں کی خبریں پڑھ پڑھ کر چیک کاٹتے رہے ہوں گے"

"ہاں۔ کرتا تو ایسے ہی تھا" دراز قد آدمی ایسی شرمندگی سے بولا جیسے مجرم اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہیں۔

شیام سندر نے اس سے ہاتھ ملا کر اپنا تعارف کراتے اسے اپنا کارڈ پیش کیا۔

"چیونٹیوں والا واقعہ تو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے"

ایک جوان عمر عورت جو غالباً اپنی ماں یا ساس کے ساتھ سفر کر رہی تھی، بیچ میں بول پڑی۔ اس کی آنکھیں واقعہ سنانے کے شوق میں چمکنے لگی تھیں۔

"بہن جی! ذرا رکیئے میں بھائی صاحب کو شیئر بازار کی پوزیشن سمجھا دوں۔" شیام سندر بہت بے صبری سے بولے۔ سراج اور رافعہ جو چیونٹیوں والے واقعے کا ذکر سن کر بے حد مشتاق ہو گئے تھے، سرد پڑ گئے۔ لیکن شیام سندر کی باتوں میں بھی دل لگتا تھا۔ شیام سندر کو افریقہ کی کمائی کا نصف بہتر، جو ابھی تک شیئر بازار میں نہیں لگا تھا، اپنے اکاؤنٹ میں داخل ہوتا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ اتنے مختصر سے وقت میں وہ ایک طویل تقریر تیار کر چکے تھے۔

"ایسا ہے بندھو کہ اخبار اور میگزین سب تھیوری پر چلتے ہیں۔ اور شیئر بازار کا کھیل ہے تجربے اور عقل کا۔ کمپنی کی پوزیشن اور ہوتی ہے اور شیئر کی قیمت اور۔ مثال کے طور پر ٹاٹا کمپنی بڑی کمپنی ہے پر آج کل اس کے شیئر زمین سے آن لگے ہیں۔"

"ٹاٹا کوئی ایک کمپنی کا نام ہے کیا؟" رافعہ کو جنرل نالج کی کتاب یاد آئی۔

"تم نے پوری بات تو سنی ہی نہیں اور بیچ میں پٹ سے بول دیں۔ محاورے میں ایسے ہی

بولا جاتا ہے۔ ٹاٹا کی کمپنی۔ برلا کی کمپنی۔ میرا مطلب اصل میں ٹیلکو سے تھا۔"

"ٹیلکو..... جو ٹرک بناتی ہے۔" سراج بولا

"ہاں بیٹا شاباش۔" شیام سندر کی آنکھیں چمکیں۔ لیکن سراج کو ان کی شاباشی سے بہت زیادہ خوشی نہیں ہوئی کہ انہوں نے رافعہ کو بہت بری طرح جھڑکا تھا۔ اس نے رافعہ کی طرف دیکھا۔ اسے حیرت آمیز مسرت ہوئی کہ رافعہ کے چہرے پر اس بات کا کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ توجہ سے سننے کے لئے شیام سندر کی طرف ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔

"تو اتنی بڑی کمپنی ہونے کے باوجود اسکے شیئر کے دام کیوں گھٹے۔ اب افریقہ میں بیٹھ کر تو آپ یہی سمجھو گے نا کہ ٹاٹا بہت مہان کمپنی ہے۔ اسکے مالک کو بھارت رتن ملا تھا۔ فولاد کا کتنا بڑا کارخانہ ہے جمشید پور میں۔ پر حقیقت کچھ اور کہتی ہے۔ آج کل کاروبار میں ہر طرف مندا ہے جس کا اثر ہر تجارت پر ہے۔ تو جب تجارت اور لین دین کم ہوگا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر مال کم جائے گا تو ٹرانسپورٹ کا کام کرنے والے نقصان اٹھائیں گے۔ وہ نقصان اٹھائیں گے تو نئے ٹرک کیوں خریدیں گے۔ جب نئے ٹرک نہیں خریدیں گے تو ٹیلکو کے بنائے ہوئے ٹرک یارڈ میں کھڑے کھڑے زنگ کھا جائیں گے اور ٹیلکو کے شیئر کا بھاؤ آپ ہی آپ زمین پر آجائے گا۔"

وہ فاتحانہ نظروں سے سب کی طرف دیکھنے لگا۔ سارے لوگ اس کی معلومات سے متاثر نظر آرہے تھے۔ چچا صاحب کیوں کہ اونگھ رہے تھے اس لئے بچ گئے۔

"ایک بات اور بتاؤں۔ بہت ہی خاص" اس نے تجربے کے بعد اب معلومات کا ہتھیار اٹھایا۔

"زیادہ تر لوگ سمجھتے ہیں کہ ٹاٹا ہی سب سے زیادہ اور سب سے اچھے ٹرک بناتا ہے۔ نہیں صاحب بالکل نہیں۔ تھیوری اور ہے اور اصل حقیقت کچھ اور۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ سب سے زیادہ ٹرک اور سب سے اچھے ٹرک کون بناتا ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ اس کمپنی کا نام ہے لی لینڈ..... اشوکا لی لینڈ۔ آپ پوچھیں گے کہ ایسا کیوں۔ پوچھئے ایسا کیوں۔"

"ایسا کیوں؟" دراز قد آدمی کے علاوہ بھی کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ پتا تاثر ہونے والوں کی تعداد ایک سے زیادہ تھی۔

"ایسا اس لئے کہ ٹاٹا کے پاس بہت سے پراجیکٹ ہیں۔ سب پر برابر کا دھیان دینا مشکل

ہے۔ پھر کوئی بال بچہ تو ہے نہیں ان کے۔ پارسی لوگ ایک تو شادی ہی کم کرتے ہیں۔ کر بھی لیں تو بچے بہت کم ہوتے ہیں۔"

"یہ کمیونٹی بھی دھیرے دھیرے ختم ہوتی جا رہی ہے" چچا صاحب جو جاگ گئے تھے، دھیمے سے بولے اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ "ختم ہوتی جا رہی ہے" وہ آہستہ سے پھر بولے جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہوں۔

"ہاں! لیکن ہے بہت ایمان دار قوم۔ پر خالی ایمان دھرم سے کاروبار میں کام نہیں بنتا۔ پریکٹیکل وزڈم بھی بہت آوشیک چیز ہے۔ ادھر اشوک لی لینڈ والے پکے مارواڑی۔ دنیا دیکھے ہوئے۔ پیدا ہوتے ہی سب سے پہلے روپے کا ٹھنا کا سنتے ہیں۔ انہوں نے ٹرک بنانے پر خاص زور دیا اور اسے اپنی عزت سے جوڑ دیا۔ سڑکوں پر آدھے سے زیادہ ٹرک اشوکا لی لینڈ کے ہیں بھائی صاحب۔"

وہ شیئر بازار کی اونچ نیچ، موجودہ صورت حال اور مستقبل کے خوش آیند معاملات کے بارے میں گفتگو کرتا رہا۔ سراج اب بیزار ہو چکا تھا اور اس جوان عورت کو دیکھے جا رہا تھا جسے چیونٹیوں والا واقعہ سنانا تھا۔ وہ اسے اتنی دیر سے دیکھ رہا تھا کہ جب اس کی نظریں رافعہ سے ملیں تب ڈھنگ سے ہڑبڑا پایا۔ لیکن وکیل صاحب نے اس کی مدد کی جو خود یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ شیئر بروکر کی باتیں قابلِ برداشت حدود میں ہیں یا حدود سے تجاوز ہو چکا ہے۔

"بہن جی! آپ کچھ چیونٹیوں والی بات بتا رہی تھیں۔"

"جی ہاں" جوان عورت نے شال اچھی طرح لپیٹتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے برابر بیٹھی بوڑھی عورت کو اپنے ایک ہاتھ کے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

گاڑی ایک اور اسٹیشن پر رک گئی تھی۔

"پچھلے مہینے ڈائننگ ٹیبل پر میں نے بہت سی چیونٹیاں دیکھیں۔ مجھے اچرج ہوا کہ اتنی چیونٹیاں کیوں جمع ہیں۔ میں نے خوب غور سے دیکھا۔ ایک چیونٹی مری پڑی تھی۔ باقی چیونٹیاں اس کے پاس آ رہی تھیں، رک رہی تھیں، آگے بڑھ رہی تھیں۔ پھر واپس ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب چیونٹیاں اس مری ہوئی چیونٹی کو اٹھا کر لائن بنا کر کہیں چلی گئیں۔ سب کی سب اس مری ہوئی چیونٹی کے ساتھ چلی گئیں۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ گاڑی چل پڑی۔

سراج نے دیکھا اس واقعے کے ذکر سے چچا کے چہرے پر شادابی آگئی ہے۔ کیا انہیں بھی ایسا کوئی واقعہ یاد ہے۔ لیکن چچا صاحب اپنے جذبوں کا بے محابہ اظہار کبھی نہیں کرتے۔ اس نے سوچا۔

شیام سندر اب کمپیوٹر کمپنیوں کے شیئر کا ذکر نہایت سنجیدگی سے کر رہے تھے۔ سراج کو خواہ مخواہ ان کی باتوں میں دلچسپی دکھائی پڑی کیوں کہ رافعہ ان کی باتیں بہت توجہ سے سن رہی تھی۔

"ہم چھوٹے شہروں میں رہنے والے ابھی کمپیوٹر کو ٹھیک سے سمجھے نہیں ہیں۔ بڑے شہروں میں رہنے والے مڈل کلاس لوگ جو خود کو بہت انٹلکچول سمجھتے ہیں، کمپیوٹر کے بارے میں بہت کنفیوزڈ ہیں۔ اخباروں پر وہی حاوی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کمپیوٹر نے پڑوس کا رشتہ ختم کر دیا۔ کمپیوٹر نے رشتے ناطے داری کے سمبندھ توڑ دیئے۔ بچوں کی آنکھیں خراب کر دیں۔ بہت ساری نالج ایک دم سے دماغ میں بھر دی۔ ارے بھائی کوئی ان سے پوچھے کہ کیا کمپیوٹر آپ کے پاس خوشامد کرنے گیا تھا کہ اس سے کیول یہی کام لئے جائیں۔ کمپیوٹر سے جو فائدے ہوئے ہیں ان کا ذکر لوگ نہیں کرتے۔ میڈیکل سائنس کی ترقی دیکھو، انفارمیشن ٹکنالوجی کی ترقی دیکھو۔ یا تایات کی سودھائیں دیکھو۔ کمپیوٹر نے کتنے کاموں کو ہلکا کر دیا۔ لوگ کچھ بھی سوچیں، کمپیوٹر کی ترقی نہیں رک سکتی کیوں کہ یہ جیون کے ہر میدان میں کام آنے والی چیز ہے۔ آپ تو بھائی صاحب آنکھیں بند کر کے کمپیوٹر کمپنیوں کے شیئر خرید لیجئے۔ میں آپ کو کل ہی فارم بھیجوں گا۔"

دراز قد آدمی نے ہامی بھر لی۔ سراج سوچتا ہی رہ گیا کہ شیام سندر کمپیوٹر اور ٹیلی ویژن میں کچھ کچھ خود بھی کنفیوز ہیں۔

"جانوروں والی بات پر مجھے ایک کتے کا واقعہ یاد آگیا۔"

ایک ادھیڑ عمر آدمی بولا جو اب تک خاموش بیٹھا سب کی باتیں سن رہا تھا۔

زبیر، عامر اور سلمان نے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا۔ لوگ ہیں کہ انہیں واقعے پر واقعے یاد آرہے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ خاموش بیٹھے جھک مار رہے ہیں۔

"میں اپنے دوست کی کار میں ہائی وے پر جا رہا تھا۔ سامنے ایک بھورا کتا آگیا۔ دوست نے ہارن دیا تو وہ چونک کر سیدھے ہاتھ کی طرف بھاگا اور سامنے سے آنے والی کار سے کچل

گیا۔ وہیں سڑک پر لیٹے لیٹے پھڑکا اور مر گیا۔ ہم نے دیکھا وہیں کہیں سے ایک کالا کتا آیا۔ اس نے بے چینی سے اس مرتے ہوئے کتے کو بار بار سونگھا۔ ایک طرف کو چلا پھر واپس لوٹا اور پھر اسے سونگھا۔ بار بار جاتا تھا اور واپس لوٹ آتا تھا۔ اس بیچ کالے کتے کی دم اکڑ کر بالکل سیدھی ہو گئی تھی۔ جب اسے بالکل یقین ہو گیا کہ بھورا کتا مر چکا ہے تو اس نے دھیرے دھیرے اپنی دم نیچے کی اور دیر تک وہیں سڑک کے کنارے سر جھکائے کھڑا رہا۔"

سراج کو یہ واقعہ بہت اچھا لگا۔ اسے لگا جیسے اس کی آنکھیں کیمرہ بن گئی ہیں جو' کلک۔ کلک، کر کے بھورے اور کالے کتے کا فوٹو لے رہی ہیں۔

رافعہ چچا صاحب کے سینے سے الگ ہو کر اب سیدھی بیٹھ گئی تھی۔ چچا صاحب ساکت بیٹھے رہے۔

گاڑی اب یکساں رفتار سے چل رہی تھی۔ دو اسٹیشنوں کے بعد منزل مقصود تھی۔ اب پنڈت جی بہت دیر کے بعد بولے۔

"دیکھا آپ نے بھلے مانس اچھے وچار والے لوگ اگر یاد کرنا چاہیں تو انہیں کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ یاد آ ہی جاتی ہے۔"

وہ تینوں پھر کلبلائے۔ اس سے پیشتر کہ شیام سندر شیئر بازار کی بات پھر شروع کر دیں، عامر گویا ہوا۔

"ہم دسویں کلاس تک چھوٹے چچا کے ساتھ جاڑوں کے شکار میں ضرور جاتے تھے۔ اس سال برسات میں بارش کم ہوئی تھی۔ تالاب خشک تھے۔ کہیں کہیں بیچ میں پانی بھرا ہوتا تھا۔ اس سال سرمائی پرندے بھی کم آئے تھے۔ جو تھے بھی وہ ہمیں آتا دیکھ کر ہوشیار ہو جاتے تھے۔ "قائیں قائیں" کی آوازیں نکال کر ایک ساتھ بھر ا مار کر اٹھ جاتے تھے اور تالاب کے گرد دو چکر لگا کر دور کے کسی تالاب کے لئے اڑ جاتے تھے۔ میں نے ہر بار گنا وہ لمبی اڑان بھرنے سے پہلے تالاب کے دو چکر ضرور لگاتے تھے۔ اس دن ہم جس تالاب پر گئے اس کے چاروں طرف جھاڑیاں تھیں۔ آڑ میں ہم لوگ آگے بڑھے۔ جب چڑیا رینج میں آ گئی تو فائر ہوا۔ تھوڑے سے ہی پرندے تھے۔ ان میں دو چار زخمی ہو کر تالاب کی سطح پر پھڑ کنے لگے۔ باقی پرندے بھرا مار کر اٹھے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے خود گنا کہ اس دن اپنے ساتھیوں کو زخمی یا مردہ دیکھ کر ان پرندوں نے دو نہیں پورے تین چکر لگائے تھے"

سراج اور رافعہ نے عامر کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھا۔ چچا صاحب نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑے خاموش بیٹھے رہے۔ جوان عورت اور ادھیڑ آدمی بھی مطمئن نظر آئے جیسے عامر کے بتائے ہوئے واقعے سے ان کے واقعے کی بھی تصدیق ہو گئی ہو۔ شیام سندر کو بھی یہ واقعہ دلچسپ لگا۔ وہ دیر تک سرمائی پرندوں کی مختلف اقسام کے بارے میں عامر سے بات کرتے رہے۔ اسی دوران انہوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ پرندے زیادہ تر روس کی طرف سے آتے ہیں اور روس کے تعاون والی کمپنیوں کے شیئر میں پیسہ لگانا بالکل حماقت کا کام ہے کیوں کہ روس معاشی میدان میں بالکل پٹ چکا ہے۔

اگلے ہی اسٹیشن پر اترنا تھا۔

تب افریقہ میں کاروبار کرنے والے دراز قد آدمی نے سر اٹھا کر سب کو باری باری دیکھا۔ یہ سردیوں کا زمانہ تھا اس لئے باہر ابھی بھی اندھیرا تھا۔ دراز قد آدمی کچھ بولنا چاہتا تھا۔ سراج پر بے دلی چھائی ہوئی تھی۔ رافعہ بھی خاموش بیٹھی اپنے عم زادوں کو دیکھتی رہی۔ جوان عورت نے اونگھتی ہوئی بوڑھی عورت کے سر کو پہلے تو کندھے سے لگایا پھر جگہ بنا کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور اسے بچوں کی طرح تھپکیاں دینے لگی۔ چچا صاحب نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر آنکھیں بند کر کے سوچا کہ بوڑھی عورت یقیناً اس جوان عورت کی ماں ہے۔ یا یہ جوان عورت اس بوڑھی عورت کی اولاد ہے۔ مگر ان دونوں باتوں میں فرق کیا ہے۔ چچا صاحب آنکھیں بند کئے دیر تک سوچتے رہے۔ سب باتیں کرتے کرتے اور باتیں سنتے سنتے تھک سے گئے تھے کہ اسی وقت دراز قد آدمی نے کہنا شروع کیا۔ اس کی آواز بھاری اور افسردہ تھی۔

''میں افریقہ کے ساؤتھ کے جنگلوں میں سفاری پر گیا تھا۔ وہاں گھنے لیکن نیچے نیچے درختوں اور جھاڑیوں کے جنگل میں ہم لوگ رکے تھے۔ گائیڈ نے بتایا کہ سامنے جو ہاتھیوں کا جھنڈ آرہا ہے، یہ موسمی ہجرت کے بعد واپسی کے سفر پر ہے۔ ہم نے دیکھا جھنڈ میں بہت سے ہاتھی تھے۔ ان کے بچے بھی ان کے ساتھ تھے جو کبھی دوڑ کر آگے نکل جاتے تو بڑی بڑی مادائیں سونڈ سے ان کے کان پکڑ کر کھینچ کر لے آتیں۔ ہاتھیوں نے بدن پر گیلی گیلی مٹی جما رکھی تھی۔ گائیڈ نے ہی ہمیں بتایا کہ گیلی گیلی مٹی جما کر ہاتھی اپنے بدن کا ٹمپریچر درست رکھتے ہیں۔ ہاتھیوں کا راستہ جنگل میں مقرر رہو تا ہے۔ ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں اور کچلی ہوئی گھاس کو دیکھ کر وہاں کا

بچہ بھی بتا دیتا ہے کہ یہ ہاتھیوں کی گزرگاہ ہے۔ ہم اس گزرگاہ سے پچاس قدم کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ ہم لوگ خاموش تھے اور ہوا کا رخ ہماری ہی جانب تھا اس لئے ہاتھیوں کو ہماری موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔ وہ ہمیں اتنی دور سے دیکھ بھی نہیں سکتے تھے کیوں کہ ان کی نگاہ کمزور ہوتی ہے۔ اچانک ہم نے دیکھا کہ گزرگاہ کے پاس ایک ہاتھی کے سر اور ٹانگوں کی بڑی بڑی سفید ہڈیاں پڑی ہیں۔ دو بڑی مادائیں جھنڈ سے الگ ہو کر ان ہڈیوں کے پاس گئیں۔ اپنی اگلی بھاری ٹانگوں سے ان ہڈیوں کو ہولے ہولے چھوا۔ دیر تک ان ہڈیوں پر اپنی سونڈ رکھے رہیں۔ وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتی تھیں لیکن ہم نے انہیں دیکھا اور مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ ان کی چھوٹی چھوٹی دھندلی دھندلی آنکھوں سے آنسوؤں کی لکیر سی بہہ رہی تھی۔ جتنے عرصے تک ان ماداؤں کی سونڈ ان ہڈیوں پر رکھی رہی، ان کے بدن اندر کے دکھ کی طاقت سے زور زور سے کانپتے رہے اور وہ منہ سے ایک ایسی آواز نکالتی رہیں جو سنائی تو نہیں دیتی تھی لیکن اس کے ارتعاش سے جنگل کے تمام درخت کانپتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔"

دراز قد آدمی خاموش ہو گیا۔ رافعہ نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے تھے۔ جوان عورت نے بوڑھی عورت کو اور زیادہ شدت کے ساتھ اپنے بدن سے لپٹا لیا تھا۔ چچا صاحب نے رافعہ کے شانے پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ شیام سندر شیئر بروکر کچھ افسردہ سے ہو گئے تھے کیوں کہ اب وہ پہلے جیسے بلند لہجے میں نہیں بلکہ دھیمی دھیمی آواز میں سب کو بتا رہے تھے کہ ہاتھیوں کے دانت کی صنعت دنیا بھر میں اب تباہی کی کگار پر ہے۔ افریقی ممالک میں بھی دھیرے دھیرے جنگلی جانوروں کے تحفظ کا شعور عام ہو رہا ہے۔ ہاتھی دانت کی صنعت کے شیئر میں عقلمند آدمی کو پیسہ نہیں لگانا چاہئے۔ بوتسوانا میں ہاتھیوں کی تعداد اس تعداد سے کہیں زیادہ ہے جتنی فطری طور پر ہونا چاہئے۔ عام طور پر کسی جنگل کی صحیح نشو و نما اور ترقی کا اندازہ ہاتھیوں کی تعداد سے لگایا جاتا ہے لیکن بوتسوانا کے معاملے میں یہ فارمولا غلط ثابت ہو چکا ہے۔ دراصل وہاں کے دیہی عوام اور کاشتکاری کا تعلق ...... جنگل میں سرمایہ کاری اور حکومت کی پالیسی اور کچھ ..... سماجی پیچیدگیاں... اور...

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ اسٹیشن آ چکا تھا۔ پانچ بجنے ہی والے تھے۔ سب لوگ تیزی سے نیچے اترے۔

اسٹیشن کے باہر بس کھڑی تھی جو لگ بھگ بھر چکی تھی۔ یہ صبح کاذب کا وقت تھا۔

اسٹیشن کی عمارت، سڑک اور بس اور　　فر سب دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ عامر، سلمان اور زبیر دوڑ کر بس میں بیٹھ کر جگہ بنا چکے تھے۔ اس ڈبے کے باقی مسافر تیزی سے بس کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اسی وقت مخالف سمت سے آتا ہوا ایک ٹرک سڑک پار کرتے ہوئے ایک شخص کو کچلتا ہوا نکل گیا۔ سڑک پر موٹی موٹی سرخ لکیریں دور تک کھنچتی چلی گئیں تھیں۔ خون میں لت پت وہ شخص سڑک پر پھڑکا اور ساکت ہو گیا۔ ٹرک رکا نہیں تھا۔

کنڈکٹر نے سیٹی بجائی۔ بس آگے بڑھی۔ چچا صاحب اندر داخل ہو چکے تھے۔ رافعہ اور سراج بھی بھیڑ کے دھکے سے اندر پہنچ گئے تھے۔ پیچھے شیام سندر تھے اور آگے چچا صاحب۔

"سراج! سراج! وہ کون تھا۔" رافعہ نے سراج کے کندھے پر ماتھا ٹیک کر پوچھا۔ اسے متلی سی محسوس ہو رہی تھی اور آنکھیں دھندلی ہو گئی تھیں۔

"میں اسے نہیں پہچانتا رافعہ" سراج نے رافعہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر دھیمے سے کہا اور اس کی آنکھوں میں غور سے جھانکا۔ "میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"لیکن میں اسے خوب پہچانتا ہوں" شیام سندر نے کہنا شروع کیا۔

"حالانکہ اندھیرا تھا۔ میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا۔ لیکن معلومات اور تجربے سے بھی انسان بہت کچھ جان سکتا ہے۔ میرے لئے یہ بتانا بالکل مشکل نہیں ہے کہ وہ ٹرک یا تو اشوک لی لینڈ کمپنی کا تھا یا پھر ٹاٹا کمپنی کا۔"

تب بوڑھے نے کمبل اور بریف کیس فرش پر ڈال کر کانپتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے اور آنکھوں کو چھپا لیا۔ سب مسافروں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب انہوں نے بہت واضح انداز میں محسوس کیا کہ بوڑھے کے سینے سے ابلنے والی آوازیں سنائی تو نہیں دیتی تھیں لیکن ان آوازوں کا ارتعاش اتنا زبردست تھا کہ دوڑتی ہوئی بس کا ایک ایک حصہ کانپنے لگا تھا۔

○○

تلاشِ رنگِ رائیگاں

اس نے پہاڑی کے موڑ پر کھڑے ہو کر کہرے میں ڈوبی وادی کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں کو دیکھا اور پھر مٹھی کھول کر دیر تک اس شئے کو دیکھتا رہا۔

کیا سب کچھ ایک سراب تھا۔ کیا تمام زندگی رائیگاں چلی گئی؟۔ اس نے سوچا۔

ٹھنڈی ہوائیں، بہت تیز ہو گئیں تھیں اور ان کا لمس تکلیف دہ سرگوشیاں کرنے لگا تھا۔

تب اس نے آنکھیں بند کر کے دور تک دیکھا۔ دور، بہت دور۔

☆☆☆

"یہ کیا ہے ارشد"...... پڑوسی کی بیٹی نے اس اندھیرے کمرے میں لے جا کر اسے قریب کر کے پوچھا جہاں سب بچے آنکھ مچولی کھیلتے میں چھپتے تھے۔

"مجھے نہیں معلوم۔" غزالہ آپا کی گرم گرم سانسیں اس نے اپنے چہرے پر محسوس کیں۔

"تمہیں سب معلوم ہے۔ اب تم بچے نہیں ہو۔" تب اس نے غور سے دیکھا۔ اور ویسا ہی لذت بھرا خوف محسوس کیا جیسا رحمت علی کے مکان کی دیوار سے جھانکتی امردو کی شاخ سے امردو توڑتے وقت محسوس ہوتا تھا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ اٹھایا اور بہت دیر تک اس فکر میں ڈوبا رہا کہ اس کی انگلیاں سخت ہیں یا وہ جگہ بہت نرم ہے۔

"تم اب غزالہ کے ساتھ اکیلے مت کھیلا کرو۔" امی نے کہا تھا۔

اس کے سہم کر ماں کو دیکھا۔ ماں کی آنکھوں میں عجیب شرمندہ شرمندہ سا غصہ تھا۔

وہ اور زیادہ سہم جاتا اگر اسی وقت کمرے کے اندھیرے میں گھلی ہوئی وہ لذت اسے نہ یاد آجاتی۔

"کیوں؟ میں تو کھیلوں گا۔ کل تم نے بڑے کو حلوہ کیوں دیا تھا جب کہ دن بھر میں نے ضد کی تھی کہ میرے لئے حلوہ بناؤ۔"

"ارے وہ بھی تو تمہاری ہی طرح میرا بیٹا ہے۔ جو چیز بنے گی اس کا بھی حصہ ہوگا۔"

"دیکھو امی تم میرے منہ نہ لگا کرو۔ میں کہیں بھاگ جاؤنگا۔"

"ابھی تم پڑھ لکھ لو۔ ساتواں پاس کو تو کوئی منشی گیری پر بھی نہیں رکھے گا۔" ماں رسان سے بولی۔

"پڑھنے لکھنے کے بعد تو سبھی بیٹے بھاگ ہی جاتے ہیں۔" اماں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ سوچ کر کہا۔

ارشد کو معلوم تھا کہ اماں نے ماموں کے بارے میں سوچا ہوگا جن کا واقعہ وہ ہمیشہ سناتی ہیں کہ جب وہ نوکری کرنے لگے تو بیوی کو لے کر الگ رہنے لگے تھے اور بوڑھے نانا نانی اپنی کنواری غریب بیٹیوں کے ساتھ سنیچر کی رات کو ان کا انتظار صرف اس لئے کرتے تھے کہ بھیا آئے تو اسے ہفتہ بھر کے جمع کئے ہوئے پیسوں سے خوب مرغن کھانا کھلائیں۔

"بس میں بتا رہی ہوں کہ اب تم غزالہ کے ساتھ نہیں کھیلو گے۔ سمجھے کہ نہیں۔ اگر اب تمہیں پیچھے والے کمرے میں کھیلتا دیکھ لیا تو تمہارے ابا سے کہہ دوں گی۔"

"کہہ دینا...... اور پٹوا لینا...... اپنے آپ کو نہیں دیکھتی ہو کہ میرے کہنے پر حلوہ بنایا اور

بڑے کو بھی دے دیا۔ اس نے دن بھر رو رو کر ضد کی تھی کیا؟ میں صبح سے چلا تا رہا تھا۔ میں اسی کے مارے اسکول بھی نہیں گیا تھا۔ میرے حصے کا حلوہ بھی اسی کو دے دیتیں۔"

اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں اور ان میں پانی تیرنے لگا تھا۔ آواز بھرا گئی تھی۔

ماں نے قینچی ایک طرف رکھی اور اسے اپنے قریب کھسکا کر بٹھا لیا۔

"دیکھو ارشد...... تم مجھ سے ایسے لڑتے ہو جیسے میں تمہارے برابر کی ہوں۔ میں تمہاری ماں ہوں ماں۔ تمہیں کئی بار بتا چکی ہوں کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔ حضور نے منع فرمایا ہے ماں باپ کی نافرمانی کرنے کو۔ بہت گناہ ہوتا ہے بیٹے۔ اور تم ابھی اتنے چھوٹے ہو اور ابھی سے اتنی چڑھا اوپری کی باتیں کرنے لگے ہو۔ کل تم یہ بھی کہو گے کہ بڑے کے کپڑے کیوں سل رہے ہیں اور بڑے کو کھانا کیوں مل رہا ہے اور بڑے کو سونے کے لئے پلنگ کیوں دیا جاتا ہے۔ بیٹے تم اور میرے سب بچے میرے لئے برابر ہیں۔"

"تو اماں ایک بتاؤ" حضور کی بات سن کر وہ سہم گیا تھا اس نے جلدی سے انگوٹھے بھی چوم لئے تھے۔ وہ اور قریب کھسک کر بیٹھا اور اماں کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں خوب زور سے پکڑ لیا۔ "اماں۔ تم ہم سب میں سب سے زیادہ کسے چاہتی ہو" جملہ پورا کرنے سے پہلے اس نے اماں کے ہاتھوں کو بہت زور سے بھینچ لیا تھا کہ اماں اسے اس کی مرضی کا جواب دے دیں۔

اماں نے بہت حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم یہ کیوں پوچھتے ہو۔ میں سب کو برابر سے چاہتی ہوں۔" اتنے میں بڑا آ گیا۔

"تم اب تک اسکول نہیں گئے۔ انٹرول ختم ہوئے کتنی دیر ہو گئی۔" بڑے نے پوچھا

"تم خود یہاں گھوم رہے ہو۔ انٹرول تمہارے لئے نہیں ختم ہوا کیا۔؟" اس نے اچک کر الٹا سوال کر دیا۔

"میرا پی ٹی کا گھنٹہ خالی تھا۔" بڑے نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

اسے اس جواب کے برابر کا کوئی جواب نہیں سوجھا۔

"بڑے تم اس وقت یہاں سے جاؤ۔ میں اماں سے ایک خاص بات کر رہا ہوں۔ جاؤ یہاں سے۔"

بڑے نے اپنے بڑے ہوتے چھوٹے بھائی کو دیکھا پھر ماں کو دیکھا۔ وہ چھوٹے کی ضدی عادتوں سے خوب واقف تھا۔ بڑے نے کچھ کہنا چاہا کہ ارشد بول اٹھا۔

"تم جاتے ہو بڑے کہ نہیں۔ میں اماں سے کوئی بات کروں تم آ کر کھڑے ہو جاتے ہو سامنے۔" اس نے بوا کے انداز میں کہا۔

بڑے نے بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اماں میں تمہاری اور ارشد کی باتیں سننے کے لئے بھلا کب کھڑا ہوا تھا۔ تم بھی خاموش ہو۔ تم بھی اس کی طرف داری کرتی ہو۔ میں تو تم سے اس وقت یہ کہنے آیا تھا کہ اسکاؤٹ کے اسکارف کے لئے گھر میں کپڑا ہے کہ نہیں اگر نہیں ہے تو ابا سے پیسے مانگ دو۔

بڑا تھوڑی دیر تک بے بسی سے کھڑا رہا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کی حلق میں کوئی چیز اٹکنے لگی ہے۔ وہ وہاں سے آنگن میں چلا گیا۔

ارشد نے جلدی سے پوچھا۔

"اماں تم سچ سچ کیوں نہیں بتاتیں۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ تم بڑے کو مجھے رضیہ کو سب کو برابر سے چاہو۔ یہ تو میں نہیں مانوں گا۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم۔ بڑے کو تم نے یہاں سے رلا کر بھیجا ہے۔ دیکھو کیسا چپ چاپ کھڑا ہے۔" ارشد کو لگا اس کے دل پر کوئی چیز زوروں سے ٹکرائی۔ میں چاہے کتنی ہی محبت سے قریب آ کر چپکے سے کوئی بات پوچھوں یہ ہمیشہ اسی طرح کا جواب دیتی ہیں۔ اور پھر اس وقت بھی میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑے کو روتا دیکھ لیا۔ روتا کیا ہے بنتا ہے تاکہ اماں سب سے زیادہ اسے چاہیں۔

اماں اسے چھوڑ کر بڑے کی طرف چلنے لگیں۔

اس نے پیچھے سے چلا کر کہا۔

"اماں یہ بنتا ہے تاکہ تم مجھ سے بات نہ کر سکو۔"

بڑے نے دوسری طرف منہ پھیرے پھیرے یہ جملہ سنا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دو موٹے موٹے قطرے آنکھوں سے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ اماں نے بڑے کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا۔

پیچھے سے ارشد نے زور سے چلا کر قینچی اٹھا کر مشین میں ماری اور وحشیانہ انداز میں رونا شروع کر دیا۔

اماں کا ہاتھ بڑے کے شانوں پر تھا اور نظریں ارشد کی طرف کہ رضیہ نے اماں سے آ کر کہا۔

"اماں ابا کھانا مانگ رہے ہیں۔"

ماں نے دوسرے ہاتھ سے باورچی خانے کی طرف اشارہ کیا۔ بڑے کے کندھوں پر ایک ہاتھ۔ باورچی خانے کی طرف اشارہ کرتا ہوا دوسرا ہاتھ اور روتے ہوئے چھوٹے بیٹے کی طرف آنکھیں۔ مائیں زندگی بھر یہی کرتی ہیں۔

تم لوگ اسکول نہیں گئے۔ کیا بہانہ کر کے رُکے ہو اب تک؟۔ ابا نے سامنے آکر پوچھا۔

ارشد نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آنسو روکنے کی کوشش کی۔ بڑے نے اسی طرح منہ پھیرے پھیرے آنسو خشک کئے۔

"بڑے کا گھنٹہ خالی تھا اور ارشد کا بھی۔" امی بولیں۔

"امی۔ اسکاؤٹ کے اسکارف کے لئے پیسے دوگی یا ابا سے مانگوں" بڑے نے ہولے سے پوچھا۔

"کیا چاہئے۔ براہ راست مجھ سے کیوں نہیں مانگتے ہو۔ ماں کو کیوں پریشان کرتے ہو۔ کیوں؟"

بڑے نے کن انکھیوں سے ابا کی طرف دیکھا۔ اتنے یکم شیم ابا سے براہ راست پیسے مانگنے کی ہمت کیسے ہوتی۔ اماں تم جلدی سے کوئی ایسی بات کہہ دو کہ ابا پیسے دے دیں اور ہمیں ڈانٹیں نہیں۔ ہم دونوں فوراً کالج چلے جائیں گے۔

ماں نے بڑے کے چہرے کی جلد کے نیچے خوف اور عجلت اور شرمندگی کے جذبوں کی لہروں کو بہتے دیکھا اور بولیں۔

"اسکاؤٹ کے اسکارف کے لئے پانچ روپے منگائے ہیں اسکول نے۔ اسکاؤٹنگ کے نمبر جڑنے لگے ہیں اب نتیجے میں۔ کھانا چوکی پر رکھوں کہ دالان میں کھاؤ گے۔"

"تو مجھ سے بھی تو مانگ سکتے ہیں۔ بادامی لفافے سے نکال کر دے دو۔ کھانا دالان میں رکھ دو۔" ابا دالان کی طرف چل دیئے۔

اماں نے سہمے ہوئے بیٹوں کو ایک نظر دیکھا۔ دالان میں داخل ہوتے ہوئے ابا کو دیکھا اور خود کو اس نشے میں چور ہوتا محسوس کیا جو نچلے متوسط طبقے کی بیاہتا عورتوں کو گرہستی کا پیسہ اپنے ہاتھ سے خرچ کرنے میں محسوس ہوتا ہے۔

رضیہ نے چھوٹی سی دوپٹیہ کندھوں پر سنبھالی اور ابا کے لئے کٹورے میں پانی لے کر

دالان میں چلی گئی۔ اماں نے پانچ کا نوٹ بڑے کے ہاتھ میں دے دیا۔

"اب جلدی سے کالج چلے جاؤ تم دونوں ورنہ ابا ناراض ہوں گے۔"

جب کالج قریب آ گیا تو بڑے نے آگے چلتے ہوئے ارشد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے پوچھا۔

"تم مجھ سے لڑتے کیوں ہو ارشد۔ میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ معلوم ہے امی کہتی ہیں کہ بڑا بھائی باپ کے برابر ہوتا ہے۔"

ارشد نے پیچھے مڑ کر اپنے بڑے بھائی کو دیکھا۔ اسے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ چپ رہا تو بڑا اسے دبا لے گا۔

"ہاں ہاں یہ اماں نے ہی تمہارے دماغ خراب کیے ہیں۔ تم ہمارے لئے کمائی کرتے ہو کیا جو باپ کے برابر ہو جاؤ گے۔ اماں کی خوشامد کر کے اماں سے پیسے ہتھیا لیتے ہو، حلوے میں حصہ بٹا لیتے ہو اور بڑے سیدھے بنے رہتے ہو۔ اچھا بس اب مجھ سے مت بولو۔"

بڑے نے کالج کے میدان میں داخل ہوتے ہوئے سوچا کہ یہ میرا چھوٹا بھائی معلوم نہیں کس طبیعت کا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

ارشد نے کلاس میں بنچ پر بیٹھ کر سوچا معلوم نہیں میرا دل کیا چاہتا ہے۔ کھڑکی کے باہر کھیت تھے جن میں چھوٹے چھوٹے گیہوں کے پودے ہلکی دھوپ میں کھڑے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ ارشد نے کھڑکی میں دونوں کہنیاں ٹکائیں اور ہتھیلیوں کے کٹورے میں چہرہ رکھ کر سوچا۔

کھڑکی کے باہر بہت دور اوسر کے میدان میں ایک نالا ہے۔ اس نالے کے پار ایک گاؤں ہے۔ اس گاؤں کے پاس ایک بڑا سا تالاب ہے۔ اس تالاب میں جاڑوں کے پرندے رات کو آ کر سو جاتے ہیں۔ چچا اور چچا کے ساتھی بندوقیں اٹھائے فجر کی اذان سے پہلے گھر سے نکل جاتے ہیں۔ چچا بتاتے ہیں کہ تالاب کے کنارے کنارے بے حیا کی بے شمار جھاڑیاں ہیں۔ ان جھاڑیوں کی آڑ لے کر گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پرندوں کے پاس جاتے ہیں۔ جب کہرا صاف ہوتا ہے تو چڑیا نظر آتی ہے۔ پھر ہم ایک ساتھ بندوقیں چلاتے ہیں۔ پرندے پھڑ پھڑا پھڑ پھڑا کر تالاب میں تڑپتے ہیں۔ باقی بھر ا مار کر آسمان کی طرف سر سرا جاتے ہیں۔ ایک آدھ فائر اوپر آسمان میں کرتے ہیں۔ دو تین چڑیاں گیند کی طرح اوپر سے پانی میں گرتی ہیں۔

ذبح کی ہوئی قازیں، سیخ پر، سرخاب اور ٹیلیں آنگن میں رکھ کر جب چچا نہیں الگ الگ

کرتے ہیں تو معلوم نہیں کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی چچا کے ساتھ شکار پر جایا کروں۔ ان سب سے آگے پانی میں جا کر چڑیوں پر پہلی بندوق میں ہی چلایا کروں اور اپنی ماری ہوئی رنگ برنگی چڑیاں ڈوری سے باندھ کر اپنے کندھے پر لٹکا کر بندوق ہاتھ میں لئے میں ہی سب سے پہلے قصبے میں داخل ہوا کروں۔ چچا مجھے شکار میں کیوں نہیں لے جاتے۔ کیا وہ خود کو دنیا کا سب سے بڑا شکاری سمجھتے ہیں۔

"ارشد تم سے ہی کہہ رہا ہوں۔ سنتے ہی نہیں ہو۔ ریکھا گرٹت کی کاپی دکھاؤ۔ پائتھاگورس والا سوال بہت مشکل تھا کسی نے نہیں کیا۔"

"میں نے کر لیا ماساب" ارشد کرسی پر سیدھا بیٹھ گیا۔

"لاؤ دکھاؤ۔" جیسے انہیں یقین نہ آیا ہو۔

"شاباش" کاپی دیکھ کر ماساب نے خوش ہو کر کہا

ارشد نے کن انکھیوں سے نئے تھانیدار کی بیٹی کی طرف دیکھا جس نے ابھی ابھی مڑ کر ارشد کی طرف دیکھا تھا۔

کلاس ختم ہوا تو ارمل نے اس کے پاس آ کر کہا۔

"ہمیں اپنی 'ریکھا گرٹت' کی کاپی دو گے ہمارے گھر صفائی ہو رہی تھی سے نہیں ملا سوال کرنے کو۔"

ارشد نے چھوٹی سی شال اوڑھے ہوئے پتلے پتلے گلابی ہونٹوں والی اس خاموش خاموش سی لڑکی کی طرف دیکھا۔ اور کاپی بڑھا دی۔

یہ لڑکی بہت اچھی ہے۔ کسی سے زیادہ بات بھی نہیں کرتی۔ یہ ڈوری لال سے بھی نہیں بولتی جو خود کو بڑا پڑھا کو سمجھتا ہے۔ میں اگر کھیل میں نہ جایا کروں تو ڈوری لال سے زیادہ نمبر آئیں۔ لیکن کھیل بھی تو ضروری ہوتا ہے۔ اور پھر مزہ کتنا آتا ہے جب گیند کو پیروں سے ادھر ادھر کر کے سامنے والے کو جھکائی دے کر بھاگ کر گول کے پاس جا کر گول کے اندر گیند میں ٹھوکر مارتے ہیں۔ پھر گول کی سیٹی بجتی ہے۔ اپنے ساتھی گود میں اٹھا لیتے ہیں۔ یہ ارمل بھی اگر فٹ بال دیکھنے گراؤنڈ پر چلا کرے تو کتنا اچھا ہو۔ لڑکیوں کو بھی کھیلنا چاہئے۔ پی ٹی والے ماساب سے کہونگا کہ صرف لڑکوں کو ہی کھلانے کیوں لے جاتے ہیں۔ آخر چچا شکار میں مجھے کیوں نہیں لے جاتے۔ میں ان کے سب ساتھیوں سے زیادہ تیز دوڑ سکتا ہوں۔ کسی دن دوڑا کر دیکھ لیں۔

گھنٹہ بجنے لگا۔

کلاس کے باہر بڑا کھڑا ہوگا۔

کمرے کے اس طرف دوسرے کمرے سے پردھان ماساب کی آواز آئی جو یادو ماساب سے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

پرسوں کالج کے بوتھ میں ووٹ پڑیں گے۔ اپنے سارے لڑکے اس دن ضرور آنا چاہئیں۔ میں وعدہ کر چکا ہوں۔ اس دفعہ یہ سیٹ اپنی ہی ہونا ہے۔"

"نشچنت رہیں پردھان جی۔ کئی دن پہلے سے بات کر چکا ہوں۔ کالج کی تو اس دن چھٹی ہو جائے گی پر اپنے سارے لڑکے یہاں موجود ہوں گے۔ کیمپ پر بھی بیس پچیس لڑکا موجود ہوگا۔ کوئی چنتا نہیں کریں آپ۔"

ارشد نے ساری باتیں حفظ کر لیں۔ چچا کو بتاؤں گا کہ پردھان ماساب اور یادو ماساب میں کیا کیا باتیں ہوئی ہیں۔ معلوم نہیں چچا کون سی پارٹی کا الیکشن لڑا رہے ہیں۔ ابا تو ان سے اتنا منع کرتے ہیں لیکن وہ مانتے نہیں ہیں۔ ہمیشہ الیکشن میں آگے آگے رہتے ہیں۔

کھڑکی کے باہر گیہوں کے کھیتوں سے پرے ببول کے درختوں کے اُدھر اوسر کے میدان کے دوسری طرف نالا پار کر کے گاؤں آتا ہے۔ وہاں ایک تالاب ہے جس میں بے حیا کی بہت سی جھاڑیاں ہیں۔ اور ان جھاڑیوں کے پاس پانی میں جاڑوں کے پرندے رنگ برنگے، نیلے، سفید ہرے پیلے اور گلابی پروں والے پرندے رات کو آکر سو جاتے ہیں۔ چچا اور چچا کے ساتھی آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں۔ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں سب آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جاتے ہیں اور پھر بندوق اٹھاتے ہیں اور پھر ...... میں چچا کو الیکشن والی بات ضرور بتاؤں گا۔ کچھ سوچ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ارشد" چھوٹی سی شال پہنے گلابی ہونٹوں والی لڑکی نے اس کا نام پکارا۔ اس کے منہ سے اسے اپنا نام اچھا لگا۔

ارشد نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی شال کو دیکھا۔ اسے اچانک غزالہ آپا کی شال یاد آئی۔

کتنی گرمی نکلتی ہے غزالہ آپا کے بدن سے۔

ارمل اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ اپنی طرف اسے یوں دیکھتے دیکھ کر وہ بولی۔

''کیا بات ہے ارشد۔ آج ناشتہ نہیں بانٹو گے ؟''

''ہاں۔ہاں۔'' وہ چونک سا پڑا۔ ''چلو کیا ماساب خود بلا رہے ہیں۔'' اس نے ارمل کے چہرے پر ''ماساب خود بلا رہے ہیں'' والے جملے کا تاثر دیکھا۔

''ہاں۔سب نے اپنے اپنے کلاس کا بانٹ دیا۔ ہمارا ہی کلاس رہ گیا ہے۔ جلدی سے چلو''

باہر نکلا تو ڈوری لال سامنے کھڑا تھا۔وہ ارمل کے ساتھ ڈوری لال کے برابر سے گزرا۔ پھر کچھ سوچ کر ٹھٹھکا۔

''ڈوری لال ناشتہ لینے چلو۔ ماساب نے ناشتہ بٹوانے کے لئے ارمل کو بھیج کر ابھی ابھی مجھے بلایا ہے۔''

پڑھا کو ڈوری لال کے چہرے پر ارشد کو وہ جلن نظر نہیں آئی جسے دیکھنے کے لئے اس نے یہ جملہ کہا تھا۔وہ بیزار بیزار سا ارمل کے ساتھ ناشتہ بانٹنے چل دیا۔

چچا میاں۔پرسوں وونٹنگ ہوگی؟ اس نے بندوق صاف کرتے ہوئے چچا سے پوچھا۔

چچا نے بندوق کی نال کے اندر سے جھانک کر باہر دیکھا نیلے چمک دار فولاد کے دائرے اندر سے جھل مل جھل مل کر رہے تھے۔''ہاں''

''چچا میاں! ایک بات، بہت ہی خاص بات بتاؤں۔''

چچا نے اپنے بھتیجے کی ''ایک بہت ہی خاص بات'' سننے کیلئے اس کی طرف چہرہ موڑ لیا۔

پردھان جی آج یادو ماساب سے کہہ رہے تھے...... مگر چچا میاں آپ پھر ہمیں شکار میں لے چلیں گے۔''

''پہلے بات تو بتاؤ کیا کہہ رہے تھے پردھان جی یادو سے؟'' چچا نے جھنجھلا کر پوچھا۔

ارشد نے سہم کر پوری بات بتادی۔

چچا سوچ میں پڑ گئے۔

اللہ کرے یہ کوئی خاص بات ہو۔اللہ کرے چچا خوش ہو کر مجھے شکار میں لے چلیں۔اللہ کرے یہ کوئی بہت ہی خاص بات ہو۔

''چچا میاں شکار کو کب چلیں گے؟''

''بھاڑ میں گیا شکار۔ آج کل ویسے بھی دفعہ ۱۴۴ لگی ہے۔ کیا یادو نے یہ بھی کہا تھا کہ کیمپ پر لڑکے لگائے گا۔'' چچا میاں بہت غصے میں نظر آرہے تھے۔

"ہاں چچا میاں" وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ حالاں کہ دل بہت چاہ رہا تھا کہ پوچھے کہ کیمپ کیا ہوتا ہے اور دفعہ ۱۴۴ کیسے لگتی ہے اور دفعہ ۱۴۴ لگنے سے شکار پر کیا اثر پڑتا ہے اور کیمپ پر لڑکے کھڑے ہوں تو ووٹنگ پر کیا اثر پڑتا ہے اور شکار میں مجھے لے جانے سے چچا میاں آپ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ میرا ایئرگن کا نشانہ کتنا اچھا ہے۔ آپ کے سارے ساتھیوں سے اچھا ہے۔ میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔

یہ سب بڑے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اسے شکار اور کھیل کود کا کوئی شوق نہیں ہے۔ بس وہ دن بھر ادھر ادھر کی کتابیں پڑھے گا۔ اگر اسے شوق ہوتا تو اسے شکار میں ضرور لے جاتے چچا میاں۔ پھر مجھے بھی لے جایا کرتے۔ اب تو یہ سوچتے ہیں کہ بڑا نہیں جاتا تو ارشد کیسے جاسکتا ہے۔

یہ بڑا ہر جگہ پریشانی پیدا کرتا ہے۔

بڑے نے آکر کہا

"اماں چائے پینے بلا رہی ہیں۔"

"آخر تمھیں شکار کا شوق کیوں نہیں ہے۔ نہ تم کوئی کھیل کھیلنا جانتے ہو۔ کیا میں ہی سب کام کیا کروں۔ تم بڑے ہو کر شکار کا شوق نہیں کرتے۔ اور ہر وقت کتابیں پڑھتے رہتے ہو۔ امی کیا خود آواز نہیں دے سکتی تھیں چائے کے لئے۔"

بڑے نے حیرت سے ارشد کی طرف دیکھا اور سوچا کہ میں پرسوں دن بھر مزدوروں کے ساتھ لگا رہا۔ ٹوٹے کھمبوں اور دیواروں کی مرمت کراتا رہا۔ ارشد نے وہ تو نہیں دیکھا اور یہ دیکھ لیا کہ مجھے کھیل کود کا شوق نہیں ہے۔ میں علم حاصل کرنے کے لئے کتابیں پڑھتا ہوں۔ ارشد نے اس کی کوئی تعریف نہیں کی۔ اگر میں کھیلنے لگ جاؤں تو پڑھائی میں گول ہو جاؤں گا۔ اماں کہہ رہی تھیں کہ بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی بہن پر بہت اثر پڑتا ہے۔ میں اگر پڑھائی میں خراب رہا تو ارشد اور رضیہ کا کیا ہوگا۔ سب کچھ ارشد اور رضیہ کے فائدے کے لئے کرتا ہوں اور پھر الٹا ان ہی سے سننا پڑتا ہے۔ ایک تو اپنی چائے چھوڑ کر آیا۔ اوپر سے اتنی باتیں بھی سننا پڑیں۔

"ارشد۔ اماں چائے کے لئے بلا رہی ہیں۔" بڑا لڑائی کے موڈ میں نہیں تھا۔

"مجھے نہیں پینا چائے وائے۔ تم مجھ سے بولا بھی مت کرو اور امی کی خوشامد میں لگے رہا کرو۔" وہ جھنجھلا گیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بڑا اس سے کوئی سخت بات کہے تو وہ بھی خوب خوب سنائے لیکن بڑا تو فوراً ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ چالاک۔

وہ پلنگ پر اوندھا لیٹ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب امی خود چائے لے کر آئیں گی۔ اگر نہیں آئیں تو؟ یہ سوچ کر اس کا دل دھڑکنے لگا۔

کندھے پر ہاتھ رکھ کر کسی نے چائے کی پیالی اس کے پلنگ پر رکھ دی۔ اس نے کن انکھیوں سے پیالی رکھنے والی کے ہاتھ دیکھے اور خوش ہو گیا۔

مگر یہ کیوں نہیں بتاتیں امی کہ سب سے زیادہ کسے چاہتی ہیں۔ ایک دفعہ اگر میرا نام لے لیں تو کیا بگڑ جائے گا۔ کیا اماں کو معلوم نہیں کہ جب میں مکتب بھی نہیں جاتا تھا اور اماں کی طبیعت خراب ہوئی تھی اور بڑے کو اور مجھے اماں کے پاس جانے کی اجازت نہیں تھی۔ تین دن تک اماں اندر والے کمرے میں لیٹی رہی تھیں۔ بوا اور بڑی اماں ہر وقت اماں کے پاس جمی رہتی تھیں۔ اس وقت میں باہر جا کر گلی میں کھڑے ہو کر کتنا رویا کرتا تھا۔ ابا مجھے پکڑ پکڑ کر لے آتے تھے اور سمجھاتے تھے اب تمہارے کھیلنے کے لئے ایک کھلونا آنے والا ہے۔ تم درگاہ شریف میں جا کر دعا کیا کرو کہ تمہاری ماں ٹھیک رہیں اور آنے والا سلامت رہے۔

میری سمجھ میں اس وقت یہ باتیں نہیں آتی تھیں پھر بھی میں درگاہ شریف میں جا کر کتنی ہی دیر دعائیں مانگتا تھا۔ بڑا تو اس وقت بھی اماں کی خوشامد میں لگا رہتا تھا۔ بس ہر وقت پانی گرم کر کے اماں کے کمرے میں پہنچایا کرتا تھا۔ یا ڈاکٹر کو بلانے رحمت علی کے ساتھ اسپتال چلا جاتا تھا۔ ایک بھی دعا نہیں کی اس نے۔ پھر جب رضیہ آگئی تو میں نے اماں کو بتایا کہ اماں میں نے درگاہ پر بہت دعائیں کی تھیں تو اماں نے یہ سن کر مجھے اپنی گود میں چھپا لیا تھا۔ میری دیکھا دیکھی بڑے نے بھی اماں سے کہا تھا کہ اماں ڈاکٹر کو بلانے میں جایا کرتا تھا۔ تو اماں نے اسے بھی پیار کیا تھا۔ بڑا تو ہمیشہ سے مجھ سے جلتا ہے خاص طور سے اماں کی ہر بات میں مجھ سے برابری کرتا ہے۔ ڈاکٹر کو بلانے والی بات اس وقت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

”چائے پی لو“۔ اماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہ چپ چاپ چائے پینے لگا۔ بڑا بھی آکر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”ارشد عید پر اب کی دفعہ دھاریوں والی قمیص سلوالیں ہم دونوں۔“

بڑے نے بہت سہمے سہمے انداز میں کہا جیسے وہ تعلقات خوش گوار کرنا چاہتا ہو۔

”ہاں“ وہ اب لڑنا نہیں چاہتا تھا۔

”ارشد۔ دیوالی کی چھٹیوں میں ماموں کے ہاں چلیں گے۔ ابا بھی کہہ رہے تھے کہ تم

لوگ ہو آؤ۔" بڑے نے اس کی رضامندی چاہی۔

اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ نانا کے مرنے کے بعد اماں نے اپنے گھر جانا بہت کم کر دیا تھا۔ ارشد کو بھی اب وہاں زیادہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ماموں ہر وقت کتابوں کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ہر وقت پڑھائی لکھائی کی باتیں کرتے رہتے تھے اور ایک نانا تھے کہ ہر وقت گھماتے تھے۔

ارشد نے نانا کو یاد کیا اور بڑے سے کہا۔

"نانا کتنی چیزیں کھلایا کرتے تھے۔"

"ہاں" یہ پہلا جملہ تھا جو اتنی دیر میں ارشد نے خود مخاطب ہو کر سیدھے سبھاؤ بولا تھا۔

ارشد نے بڑے کو غور سے دیکھا پھر اماں کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں بند کر کے سوچا کہ بڑا جل رہا ہو گا۔

"اماں۔ اب تم جلدی سے اٹھ مت جانا۔ کھانا پک چکا ہے اور اب کوئی کام بھی نہیں ہے۔ میں کچھ دیر ایسے ہی لیٹوں گا۔ مجھے آرام مل رہا ہے۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر بڑے کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں خوش ہو کر نانا کو یاد کرنے لگا۔

دن بھر اسکول کرنے کے بعد اور اتنا لڑنے کے بعد اب اس کا ذہن تھک گیا تھا۔ بدن میں بھی تکان سی محسوس ہو رہی تھی۔ اماں کی نرم نرم گود میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بڑا دل ہی دل میں جل رہا ہو گا۔ آنکھیں آپ ہی آپ بند ہوتی جا رہی تھیں۔ اس نے سوچا جب تو رضیہ بھی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ ہم دونوں بھائی اماں کے ساتھ جب ننھیال میں اترتے تھے تو نانا کتنے خوش ہوتے تھے۔ فوراً اپنی کتاب لے کر پیسے نکالنے ڈاک خانے چلے جاتے تھے۔ وہاں سے واپس آ کر مجھے ایک جھٹکے میں اٹھا کر اپنی گردن پر بٹھا لیتے تھے۔ میں ان کی ٹوپی پہ ہاتھ رکھے ان کی گردن پر بیٹھا بیٹھا گلیوں گلیوں گھومتا تھا۔ وہ رک رک کر اپنے شناساؤں کو بتاتے تھے کہ منجھلی اور اس کے بچے آئے ہوئے ہیں۔ گرمیوں بھر یہیں رہیں گے پھر ان کے باپ آ کر انہیں لے جائیں گے۔ پھر وہ ندی پر لے جاتے تھے۔ مجھے اور بڑے کو ندی کے اندر لے جا کر نہلاتے تھے۔ ندی میں زیادہ پانی نہیں ہوتا تھا۔ وہ پانی پر تیرتے تیرتے ایک دم ایسے لیٹ جاتے تھے جیسے ان کے اندر سانس ہی نہیں ہے۔ ہمیں کنارے پر ہی بتا دیتے تھے کہ جب سانس روک لوں تو تم دونوں میری ٹانگیں پکڑ کر کنارے پر کھینچ لانا۔

ہم دونوں ان کی ٹانگیں پکڑ کر انہیں کنارے پر لے آتے تھے۔ ان کے ہوتے ہمیں

پانی سے بالکل ڈر نہیں لگتا تھا۔ البتہ کوئی مچھلی اگر ہمارے بدن سے ٹکرا جاتی تو ہم چیخ کر ان سے لپٹ جاتے تھے۔ وہ پانی میں ہی ہمیں زور سے لپٹا لیتے تھے۔ پانی میں ان کا بدن کتنا ہلکا ہو جاتا تھا۔

وہ کنارے پر آکر ہم دونوں کو وضو کراتے۔ پھر ہم ان کے پیچھے جھوٹ موٹ نماز پڑھتے۔ بڑا بتاتا ہے کہ وہ سچ مچ پڑھتا تھا۔ مجھے تو بس کلمہ یاد تھا وہ پڑھتا رہتا تھا اور جیسے نانا کرتے ویسے میں بھی رکوع میں "رکوع رکوع" اور سجدے میں "سجدہ سجدہ" پڑھتا تھا۔ نماز پڑھ کر وہ ندی کے اس پار بہت دیر تک دیکھتے رہتے اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دعائیں پڑھتے رہتے۔ پھر دعائیں پڑھ کر ہمارے اوپر دم کرتے۔ ہم لوگ ان کے سینے سے لگے لگے چپ چاپ ندی کے کنارے بیٹھے رہتے۔ کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ بڑا ان سے وجہ پوچھتا تو وہ بتاتے کہ تم لوگ آتے ہو تو خوش ہو جاتا ہوں لیکن تمہارے جانے کے خیال سے دل بھر آتا ہے۔ "دل بھر آنا" ہم نے ان کی زبان سے ہی پہلی بار سنا تھا۔ اماں نے بتایا تھا کہ اس کا مطلب ہے رونے کی حالت۔ اماں نے پوچھا کہ نانا نے ایسا کیوں کہا تھا۔ جب ہم نے بتایا تو وہ اداس ہو گئی تھیں۔ پھر انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ نانی کے انتقال کے بعد نانا اکیلے رہ گئے ہیں۔ ماموں دوسرے شہر میں ملازمت کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کے آنے سے دو سراہت ہو جاتی ہے۔ ہم لوگوں کے جانے کے بعد پھر تنہائی ہو جاتی ہے۔ اسی خیال سے ان کا دل بھر آتا ہے۔ شاید ان کو تمہاری نانی بھی یاد آتی ہوں۔

ایسا ہی ایک دن تھا۔ نانا نے ظہر کی نماز پڑھ کر ندی کے دوسرے کنارے پر دیکھا۔ دوسرے کنارے پر سفید اور رنگ برنگے بے شمار کپڑے پڑے سوکھ رہے تھے۔

نانا نے اچانک بڑے سے پوچھا۔

"دیکھو سامنے جو کپڑے سوکھ رہے ہیں ان میں تمہیں کون سا رنگ پسند ہے۔؟"

بڑے نے غور سے اُدھر دیکھا۔

"وہ والا" بڑے نے اشارے سے بتایا تھا۔

"وہ نیلا والا آسمانی؟" نانا نے پوچھا

"ہاں نانا"

"اور تمہیں کون سا اچھا لگتا ہے ارشد بیٹے"؟

میں نے سامنے کنارے پر پھیلے ہوئے بے شمار کپڑوں کو دیکھا۔ سرخ، نیلے، پیلے، سبز اور سفید بے شمار کپڑے پڑے سوکھ رہے تھے۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ کون سا رنگ پسند

ہے۔ بہت سے رنگ اچھے لگ رہے تھے۔ میں غور سے ادھر دیکھتا رہا۔

"بولو ارشد تمہیں کون سا پسند ہے رنگ؟"

دھوپ کی کرنیں ایک دوپٹے پر پڑ رہی تھیں۔ اس کا رنگ دھوپ سے اور بھی کھل اٹھا تھا۔ وہ دوپٹہ دوسرے دوپٹوں سے الگ پڑا سوکھ رہا تھا۔

"وہ والا نانا! وہ جو ببول کے کنارے دوپٹہ سوکھ رہا ہے وہ۔ اس کا رنگ کون سا ہے نانا؟"

"تو تمہیں اس کا رنگ بھی نہیں معلوم اور کہہ رہے ہو کہ اچھا لگ رہا ہے۔ لیکن بھائی ہے تو واقعی بہت اچھا رنگ۔ اس رنگ کو شاید دھانی رنگ کہتے ہیں۔ دھان کی بالیوں جیسا رنگ ہلکا سبز رنگ ایک اور طرف سے دیکھو تو کچھ کچھ گلابی جیسا لگتا ہے یا شاید پیازی۔ یا شاید کوئی اور نام ہو۔ ہم تو رنگ اور نام سب بھول گئے۔" وہ جانے کہاں کھو جاتے تھے۔

میں اس دوپٹے کو غور سے دیکھتا رہا۔ اچانک ہوا زور سے چلی۔ کپڑوں پر جو کنکر پتھر رکھے تھے وہ لڑھکنے لگے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور وہ دوپٹہ ہوا کے زور سے اڑتا لہراتا ہوا ندی کے کنارے کھیتوں میں جا کر کہیں کھو گیا۔

ہم تینوں اسے چپ چاپ ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ مجھے رونا سا آیا۔ میری پسند کا دوپٹہ اڑ گیا اور کوئی کپڑا غائب نہیں ہوا۔ حالاں کہ باقی بھی کپڑے ادھر ادھر بکھر گئے تھے مگر غائب کوئی نہیں ہوا تھا۔

میں نے نانا کی طرف روہانسی نظروں سے دیکھا۔ وہ ابھی تک فضا میں ایک ٹک دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ اُن میں آنسو تھے۔

"نانا۔ میرا والا رنگ اڑ گیا۔ کیا یہ کھو گیا۔؟"

"ہاں بیٹے۔ بے وقت ہوا چلے تو رنگ ایسے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔"

"ہوا کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے نانا۔" بڑے نے جو ادھر ہی دیکھ رہا تھا، پوچھا۔

"ہاں بیٹے ہوا کا وقت ہوتا ہے۔ صبح جب دھوپ نرم ہوتی ہے تو اس وقت ہوا اگر تیز چلے تو وہ بے وقت ہوا نہیں ہوتی۔ اس وقت سب اس کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ دوپہر کو دنیا بھر کے کاموں میں آدمی الجھ جاتا ہے، بھول جاتا ہے کہ رنگین کپڑوں کو دبائے رکھنے کے لئے ان پر بوجھ رکھا ہے کہ نہیں۔ اس وقت ہوا چلے تو وہ بے وقت ہوا ہوتی ہے۔ ہاں جب شام چھائے اور رات قریب آجائے اور پھر تیز ہوائیں چلیں تو کوئی فکر نہیں ہوتی۔ کپڑوں کی لادی اس وقت تک

باندھ لی گئی ہوتی ہے۔ ساری پوشاکیں سمیٹی جا چکی ہوتی ہیں۔ سارا کام مکمل ہو چکا ہوتا ہے۔"
نانا ندی کے بہتے پانی کو دیکھ کر ہولے ہولے بتاتے رہے۔

اور ارشد آنکھوں میں آنسو بھرے اس کنارے پر اس جگہ کو تکتا رہا جہاں وہ دوپٹہ سوکھ رہا تھا۔ ہوا چلی تھی۔ آسمان کے نیلے پس منظر میں تیز ہوا کے کندھوں پر دوپٹہ دھوپ میں چمک رہا تھا، اڑ رہا تھا، کھو رہا تھا۔ اور پھر کھو گیا تھا۔ کھوئے کھوئے سے پراسرار رنگ کا دوپٹہ کھو گیا تھا۔

"نانا!! او نانا!" ارشد نے ہولے سے پکارا

"ہاں بیٹے۔" نانا نے اپنے ننھے سے نواسے کو دیکھا جس کی چمک دار موٹی موٹی آنکھوں میں سرخی جھلک آئی تھی۔ وہ نانا سے لپٹ گیا۔ "میں وہ رنگ پھر دیکھوں گا۔"

نانا اس کی طرف خاموشی سے دیکھتے رہے۔

"میں اس رنگ کو ٹھیک سے دیکھ ہی نہیں پایا نانا۔ وہ کس رنگ کا تھا نانا۔ مجھے بہت ہی اچھا لگا تھا۔"

"اس کنارے پر ہوتا تو لا دیتا بیٹا۔ اُس کنارے پر ہے۔ کیسے لاؤں۔ اور پھر وہ تو دوسرے کا ہے۔ معلوم نہیں کس کا ہو؟"

"نہیں نانا لا کر دو۔ وہ کسی کا بھی ہو مجھے لا کر دو نانا۔ میں کچھ نہیں جانتا میں تو وہی لوں گا چاہے کسی کا ہو نہیں تو میں رونے لگوں گا۔"

"رووں گا کیا، رو تو رہے ہو" بڑے نے اس کی آنکھیں دیکھ کر کہا۔

"بڑے تم مت بولو۔ نانا وہ دوپٹہ لا دو"

نانا نے اسے لپٹا کر ندی میں بہتے پانی کو دیکھا اور کہا۔

"انتظار کرو ارشد بیٹے۔ کبھی نہ کبھی وہ رنگ دیکھنے کو مل ہی جائے گا۔ اس رنگ کے دوپٹے کم ہوتے ہیں لیکن ہوتے ہیں۔ گھوڑے پر بیٹھ کر ایک آدمی آئے گا اور تمہیں وہ دوپٹہ دے جائے گا۔"

"سچی نانا"۔ بڑے نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"ہاں" نانا نے ارشد کے رخساروں کو چوم کر کہا تھا۔ "چلو اب گھر چلیں۔ تمہاری ماں رستہ دیکھتی ہو گی۔"

جب وہ واپس آنے لگے تو ندی کا پانی ویسے ہی بہہ رہا تھا۔ آسمان اسی طرح سر پہ کھڑا تھا

اور زمین پہلے ہی کی طرح بیزار بیزار سی لیٹی ہوئی تھی۔ ارشد نے مڑ کر دیکھا۔ نیلے آسمان کے پس منظر میں ببول کا پیڑ کھڑا تھا۔ دھوپ چمک رہی تھی اور ببول کے پاس وہ جگہ بالکل خالی پڑی تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے ہوا چلنے سے پہلے وہ رنگ چمک رہا تھا۔ وہ جہاں تک دیکھ سکا، مڑ مڑ کر اس جگہ کو دیکھتا رہا۔ نانا کن انکھیوں سے اُسے دیکھتے رہے۔

جب ارشد اور بڑا سو گئے تو نانا نے امی سے کہا۔

"منجھلی !ارشد بہت حساس ہے اس کا خیال رکھا کرو۔"

"کیا ہوا۔ آج کچھ کہا اس نے"

"نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے"

"پھر بھی مجھے بتایئے تو"۔ بوڑھے باپ کی بیٹی نے آٹے سے سنا ہوا ہاتھ سر پہ رکھ کے پوچھا۔

"نہیں۔ کچھ باتیں صرف مردوں کی ہی سمجھ میں آپاتی ہیں۔ بس تم اس کا خیال رکھا کرو۔"

بیٹی حیران حیران بوڑھے باپ کو دیکھتے رہی۔ ارشد کو سب یاد تھا۔ اس دن وہ سویا نہیں تھا۔ صرف آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔

"اب ارشد سو گیا ہے۔ اماں اٹھ جاؤ اگر کوئی کام ہو تو۔" بڑے کی آواز کانوں میں آئی۔

جی نہیں۔ میں جاگ رہا ہوں۔ جیٹھا کیوں نہیں رہنے دیتے اماں کو میرے پاس۔"

"نہیں ارشد میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا کہ شاید اماں کو کوئی کام ہو۔ تو ارشد دیوالی کی چھٹیوں میں ننھیال چلو گے نا؟

"اس دفعہ نہیں۔ پی ٹی والے ماساب نے کہا ہے کہ دیوالی کی چھٹیوں میں ضلع میں دوڑ کی ریلی ہو گی اس میں سب کو جانا ہے۔"

شام کو غزالہ آپا آئیں ۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ پلنگوں پر گدے لگا کر پائینتی لحاف رکھے جا چکے تھے۔ ارشد بیٹھا اسکول کا کام کر رہا تھا۔

"ارشد۔ چلو آنکھ مچولی کھیلیں۔"

ارشد نے آنکھ مچولی کے نام پر ایک میٹھی سی چبھن محسوس کی مگر اماں کی بات یاد آئی۔ اس نے غزالہ آپا کی شال کو دیکھ کر اپنی انگلیاں دیکھیں اور دھیمے سے بولا۔

"غزالہ آپا! اماں منع کرتی ہیں کہ آپ کے ساتھ نہ کھیلا کروں"

"کیوں منع کرتی ہیں ارشد؟"

"مجھے کیا معلوم۔" وہ کچھ شرماسا گیا۔ "وہ یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ اب تم غزالہ کے ساتھ اندر والے کمرے میں نہیں جاؤ گے۔"

"اللہ قسم"؟ وہ ایک دم سفید پڑ گئیں۔ "ایں ارشد تم نے ان سے کچھ کہا تو نہیں؟"

"نہیں"

"کھاؤ قسم"

"خدا کی قسم کچھ نہیں کہا۔"

غزالہ آپا نے ادھر ادھر دیکھ کر جلدی سے اسے لپٹا لیا۔

ان کی شال میں چہرہ چھپا کر اسے بڑا اچھا لگا۔ مگر آج غزالہ آپا نے صرف اس کے ماتھے پر چوما اور جلدی سے الگ ہو گئیں۔

اس کا دل چاہا کہ وہ اسے اور دیر تک لپٹائے رکھیں۔ مگر وہ شرم کے مارے کچھ کہہ نہیں سکا۔

"میں جا رہی ہوں۔ روٹی پکانا ہے۔" وہ چلی گئیں۔

اماں نے آکر پوچھا۔

"غزالہ آئی تھی؟"

"ہاں اماں"

"کیا کہہ رہی تھی۔"

"کچھ نہیں اماں پوچھ رہی تھیں کہ تمہارے پاس کوئی بڑا سا کاغذ ہے کاپی پر کور چڑھاؤ نگی"۔ اس نے نہایت سکون سے جھوٹ بولا۔

"اچھا" اماں نے اطمینان کا سانس لیا۔

ارشد نے اماں کو جاتے دیکھا اور سوچا کہ کچھ نہ کچھ بات ضرور ایسی ہے جو غلط ہے۔ کہیں خدا نہ کرے غزالہ آپا وہ جادوگرنی تو نہیں ہیں جو اندھیرے میں بچوں کو لے جا کر مینڈک بنا دیتی ہے۔

نہیں نہیں غزالہ آپا جادوگرنی تو ہر گز نہیں ہو سکتیں۔ جادوگرنی کے پیر تو الٹے ہوتے ہیں۔ مگر الٹے پیر تو چڑیل کے ہوتے ہیں۔ لیکن غزالہ آپا مجھ سے اتنے پیار کیوں کراتی ہیں۔

پھر اتنی زور زور سے سانس کیوں لینے لگتی ہیں۔ ان کا چہرہ سرخ کیوں ہو جاتا ہے اور ......
بس اس کے آگے وہ سوچتا تو اس کا دل چاہتا کہ وہ رحمت علی کے مکان پر جھک کر امرود کی شاخ پر سے اچک اچک کر سارے کچے پکے امرود توڑ لے اور دانت گڑ گڑا کر سارے امرود کھا جائے۔
کاپی پر دائرہ بناتے بناتے اس نے اتنی زور سے پنسل چلائی کہ نوک ٹوٹ گئی ۔اس نے کٹر نکال کر دوبارہ پنسل بنانا شروع کی۔

○❖○❖○

وو ننگ کے دوسرے دن بچا بہت خوش تھے۔ انہوں نے اس دن ارشد کو خوب ٹافیاں لا کر دیں اور یہ بھی کہا کہ وہ جب آٹھویں پاس کرے گا تو اسے شکار میں لے جایا کریں گے۔
"مگر چچا میاں ۔ اتنے دن بعد... ابھی کل ہی چلئے۔
"نہیں۔ ابھی نہیں۔ ابھی تم بہت چھوٹے ہو۔" چچا نے ہلکی سی سختی کے ساتھ کہا۔
کالج میں پردھان ماساب اور یادو ماساب کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔
سردیاں اب جم کر پڑنے لگی تھیں۔ رات کو چچا میاں صبح کے شکار کا پروگرام بنا رہے تھے۔
دیکھو بھئی۔ صبح یادو کے گاؤں والے راستے سے نہیں جانا ہے۔ بد تمیز لونڈے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ نیل گائے مارنے پر وبال کھڑا کر دیں۔ کچھ دگڑے والے راستے سے چلیں گے۔ میدان میں نیلے مل گئے تو ٹھیک۔ نہیں تو تالاب پر پہنچ کر چڑیا دیکھیں گے۔"
"چچا میاں میں بھی چلوں گا۔ کل اتوار ہے"
"نہیں میاں تمہیں کئی بار منع کر چکا ہوں کہ ابھی نہیں ابھی تم اس قابل نہیں ہوئے کہ میدان میں شکار کھیلنے جاؤ۔"
وہ بڑبڑاتا ہوا آیا اور پلنگ پر لیٹ کر لحاف اوڑھ لیا۔ رات کے آخری پہر اس کی آنکھ کھلی ۔ بجلی نہیں تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ آنگن سے نکل کر بچا اور چچا کے ساتھی شکار کو جا رہے تھے۔ اندھیرے میں وہ بہت رعب دار اور ہیولے جیسے لگ رہے تھے۔ بندوقیں اور تھیلے ان کے ہاتھ میں تھے۔
اب صبح ہو گی۔ پھر کہرا صاف ہو گا۔ بے حیا کی جھاڑیوں کے پاس چچا کھڑے ہوں گے۔ تالاب میں رنگ برنگے پرندے ہوں گے۔ چچا بندوق اٹھائیں گے.... میں کتنے دن بعد بڑا

ہو پاؤں گا۔ اس نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے سوچا۔

صبح ناشتے پر اس کی اماں اور بڑے سے خوب تکرار ہوئی۔ کالج میں کلاس ختم ہونے پر بھی وہ نہیں اٹھا۔ آج وہ ناشتہ بانٹنے بھی نہیں گیا۔ اس نے سیکنڈ مانیٹر سے کہہ دیا کہ ناشتہ بانٹ دے۔

وہ ڈیسک پر سر رکھے، آنکھیں بند کئے کھیتوں میں بھاگتا رہا۔ آب پاشی کئے گیلے گیلے کھیت جن میں گیہوں اب گھٹنوں گھٹنوں کھڑا تھا۔ پھر پگڈنڈی پر آکر اس نے دوڑ لگائی اور ٹیلے کی طرف نظر اٹھا کر دوڑتے ہی دوڑتے دیکھا۔ اسے لگا جیسے ٹیلا بھی اس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہے اور ٹیلے پر چرتی سفید بھیڑیں ٹیلے پر ساکت ہو گئی ہیں۔ آسمان پر اڑتی ہوئی چیلیں اسے بہت پاس نظر آئیں۔ گیہوں کے کھیتوں سے نکل کر پگڈنڈی پر دوڑ لگاتا ہوا وہ میدان میں پہنچا۔ میدان سے نکل کر اس نے نالے کی پلیا پار کی۔ پلیا کے ادھر والا گاؤں دیکھتا ہوا وہ تالاب کے پاس پہنچا۔ تالاب کے کنارے بے شمار جھاڑیاں تھیں اور جھاڑیوں کے اس طرف نیلے، سرخ، ہرے اور سفید پرندے تیر رہے تھے۔ اس نے بندوق اٹھائی۔ سر جھکایا۔ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں آہستہ آہستہ چلا۔ سر اٹھایا۔ بندوق تانی اور جیسے ہی فائر کرنے کے لئے لبلبی دبائی۔ چچا میاں نے اسکے ہاتھ سے بندوق چھین لی۔ تم ابھی چھوٹے ہو اس لائق نہیں ہو کہ میدان کے شکار میں جا سکو۔ وہ ایک دم رو پڑا۔

"چچا میاں۔ آپ بندوق چلوا کر دیکھ لیجئے میں شکار کر سکتا ہوں۔"

"تم کیوں رو رہے ہو ارشد۔ تم نے آج ناشتہ بھی نہیں بانٹا۔" اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ارمل کھڑی تھی۔ آج اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے سیاہ بال اس کے گلابی چہرے کے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے اور سرخ دوپٹہ اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے گیلی گیلی دھندلی دھندلی آنکھوں سے ارمل کی طرف دیکھا۔ اسے لگا وہ اسے بہت دور سے دیکھ رہا ہے۔ جیسے بے حیا کی جھاڑیوں کے پار پر سکون تالاب میں اکیلی شیرازی قاز تیرتے تیرتے رک گئی ہو۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ارمل کے بالوں کو چھوا جیسے اس شیرازی قاز پر بندوق اٹھائی ہو۔ مگر یہاں اس کے ہاتھ سے بندوق نہیں چھینی گئی۔ ارمل کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"کیا بات ہے ارشد۔ میرا سر کیوں چھوا تم نے؟"

"ایسے ہی ارمل۔" آج اس نے پہلی بار اس کا نام لیا تھا۔ "تمہارے بال بہت سارے

ہیں"۔

"ہاں اماں بھی یہی کہتی ہیں۔" اس نے بھولے پن سے کہا۔

اس کا دل چاہا کہ ایک بار پھر ارمل کے بالوں کو چھوئے اور ارمل اس سے پھر کہے کہ تم نے میرے سر کو کیوں چھوا۔ اس نے پھر اس کے بالوں کو چھوا۔ اسی طرح وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ دیر تک آنکھیں بند کیئے وہ ہنستی رہی۔

"تمہیں معلوم ہے ارشد۔ پاپا جی کا ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ ہم لوگ کل پر تاپ گڑھ جا رہے ہیں۔"

"آئیں ۔ تم بھی چلی جاؤ گی کیا۔؟"

"اے لو۔ سبھی جائیں گے۔ ہمارا وہاں جاتے ہی داخلہ ہو جائے گا۔ اپنی 'ٹنک گڑت' کی کاپی دے دینا کل تک۔ سارا پہلا والا ہوم ورک پورا کرلوں گی۔" اس کی موٹی موٹی آنکھیں اپنے سوال کا جواب مانگ رہی تھیں۔

"لے لینا۔ تم پھر یہاں آیا کرو گی کہ ہمیشہ کے لئے چلی جاؤ گی؟" ارشد نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اب پاپا بڑے کوتوال ہو گئے ہیں۔ یہاں کا تھانہ چھوٹا ہے یہاں اب نہیں آئیں گے۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے دھیمے دھیمے بولی۔

ارشد نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دماغ سے کوئی چیز اتری ہے جو ماتھے اور آنکھوں کے بیچ کہیں اٹک گئی ہے، نیچے نہیں اتر رہی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ چیز نیچے اتر جائے لیکن وہ وہیں اٹکی رہی۔ تب وہ اندر ہی اندر جانے کس پر غصہ ہوا۔

یہ کیسی عجیب لڑکی ہے۔ یہ بالکل بے وقوف لڑکی ہے۔ یہ 'ریکھا گڑت' بھی نہیں کر سکتی۔

"تم نے مجھے فٹ بال کھیلتے دیکھا ہے ارمل؟ اس نے ارمل سے پوچھا۔

"نہیں میں کبھی گراؤنڈ پر گئی ہی نہیں۔ لڑکیاں جاتی کہاں ہیں وہاں۔"

وہ چپ رہا پھر بولا

"آج چچا شکار پر گئے تھے۔ مجھے بھی لے جا رہے تھے لیکن میں نہیں گیا۔ مجھے اسکول کا کام تھا نا۔ میں تالاب کے کنارے کنارے کھڑے ہو کر ایک ہی فائر میں بہت سی چڑیاں مار سکتا

ہوں۔ اور فٹ بال میں پچھلے میچ میں اکیلے تین گول مارے تھے۔"

"اچھا"۔ ارمل نے اس کی بے تکی باتوں پر بے سمجھے بوجھے کہا۔

"آج میرے بڑے بھائی کو خوب ہی ڈانٹ پڑی۔ وہ ہر چیز میں ہی میری برابری کرتے ہیں۔ آج اماں نے صبح ناشتے میں سارا حلوہ مجھے دے دیا تھا بس اسی بات پر وہ جل گئے تھے۔ اماں سب سے زیادہ مجھے چاہتی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے؟"

"میری ماتاجی بھی پپو بھیا کو بہت چاہتی ہیں"۔ اس نے خالی خالی سپاٹ آواز میں کہا جیسے کوئی سین دہرایا ہو۔ اس نے جھنجھلا کر اپنا سر ڈیسک پر رکھ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"کیا بات ہے ارشد۔ تمہیں بخار ہے کیا۔" اس نے ارشد کا ہاتھ پکڑا" بخار تو نہیں ہے۔ ماساب نے ڈانٹا ہے۔؟"

"نہیں تو۔" اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا

"اے ارمل تم سچ مچ کل چلی جاؤ گی۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں کل ٹرک آئے گا۔ پاپاجی کہہ رہے تھے کل چار بجے ہم سب چلے جائیں گے۔ میں تین بجے تک سارا کام پورا کر لوں گی تم آج شام تک مجھے اپنی کاپیاں دے دو گے۔؟"

وہ چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اسے حیرت اور محبت سے تکتی رہی۔ پھر اس کے بالوں کو جھنجھوڑ دیا۔ ڈب ڈب کر کے دو آنسو اس کی آنکھوں میں چمکے۔

ارے کیا تم رو رہے ہو۔ تمہارے پتاجی نے ڈانٹا تھا کیا آج؟

"نہیں تو" وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا۔ "ارمل میں ریکھا گڑت اور انک گڑت کی کاپیاں دوسری کاپیوں پر اتار کر تمہیں دے دونگا۔ تم کو نقل نہیں کرنی پڑے گی۔ کل جاتے وقت تک میں اتار کر تمہیں دے دوں گا۔"

"سچی۔" وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ تب تو میں ڈوری لال کی کاپی سے اتہاس بھی اتار لوں گی۔"

ارشد کو دھکا سا لگا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ اس نے سوچا میں کچھ کہوں گا تو ارمل سمجھے گی میں ڈوری لال سے جلتا ہوں جیسے میں سمجھتا ہوں کہ بڑا امی کے معاملے میں مجھ سے جلتا ہے۔

وہ جانے کے لئے مڑی تو اس نے پکارا۔

"ارمل!"

"ہاں کیا بات ہے۔"

"کلاس میں سب سے اچھی رائٹنگ کس کی ہے؟"

"تمہاری رائٹنگ مجھے سب سے اچھی لگتی ہے۔" سفید لباس پہنے اس چھوٹی سی لڑکی نے سرخ دوپٹے کو گلے میں ٹھیک سے لپیٹا اور سرد ہوا میں باہر نکل گئی۔

تمہاری رائٹنگ مجھے سب سے اچھی لگتی ہے۔

تمہاری رائٹنگ مجھے سب سے اچھی لگتی ہے۔

اس نے چم چم کرتی آنکھوں سے کھڑکی کے باہر کھیتوں کو دیکھا، دیر تک دیکھا اور چپ چاپ آنکھیں بند کر لیں۔ کل یہ چلی جائے گی۔

کالج سے واپسی پر وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے۔ بڑے نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ آج ارشد کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا کہ بڑا کچھ کہے تو وہ اس سے لڑنا شروع کر دے۔ گھر پہنچ کر اس نے پہلی بار براہ راست ابا سے ڈیڑھ روپے مانگے۔ دو کاپیاں خریدیں اور پلنگ پر بیٹھ کر 'انک گزٹ' اور 'ریکھا گزٹ' اتارنے لگا۔ رات گئے تک وہ کام کرتا رہا۔ ابا نے سونے کو کہا تو کہہ دیا کہ چھماہی امتحان قریب آگئے ہیں۔ ماساب زیادہ زیادہ سوال دینے لگے ہیں۔ دوسرے دن کالج میں ارمل نہیں آئی تھی۔ اس نے کالج کے باہر کھڑے سپاہی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ تھانیدار صاحب چار بجے یہاں سے ٹرک میں سامان لدوا کر نکلیں گے۔ میں ٹرک کا ہی انتظار کر رہا ہوں۔

"ارمل کیا کر رہی ہے گھر پر"؟

"بٹیا اسکول کا کام کر رہی ہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ ارشد آئے تو اسے گھر بھیج دینا"

وہ ارمل کے گھر نہیں گیا۔

کالج ختم ہونے پر باہر بنچ پر بیٹھ گیا۔ بڑے نے گھر چلنے کو کہا تو کہہ دیا کہ وہ یہاں سے سیدھا گراؤنڈ پر جائے گا۔ آج فٹ بال کا میچ ہے۔

"چائے بھی نہیں پینے چلو گے۔؟"

"نہیں۔ اب تم جاؤ" وہ نہیں چاہتا تھا کہ بڑا اسے ارمل کو کاپیاں دیتا دیکھ لے۔ ہر بات امی سے لگا دیتا ہے۔ پھر ابا پوچھ لیتے کہ ڈیڑھ روپے کی کاپیاں دوسروں کو دینے کے لئے رات بھر لکھتے رہے تھے۔

"اچھا تو یہ بستہ تو مجھے دے دو۔ گراؤنڈ پر کتابیں بھی لے جاؤ گے کیا۔؟" بڑے نے بہت رسان سے کہا۔

"تم جاتے کیوں نہیں ہو۔ میں اپنا بستہ لے کر خود آؤں گا۔"

بڑا خاموشی سے چلا گیا۔

پلیا پر بیٹھا ہوا وہ انتظار کرتا رہا۔ تھانے والی سڑک پر دور دور تک کوئی ٹرک نظر نہیں آرہا تھا۔ اب تو پانچ بج رہے تھے۔ کیا جانے کا ارادہ بدل دیا۔ وہ اندر ہی اندر خوش ہوا ہی تھا کہ سامنے سے ٹرک نظر آیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ٹرک رکوایا۔ ڈرائیور نے کہا کہ تھانے دار صاحب جیپ میں پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔

وہ چپ چاپ پھر پلیا پر بیٹھ گیا۔ ارمل چلی جائے گی تو ناشتہ بنوانے کے لئے ماساب کس کو بھیج کر مجھے بلایا کریں گے۔ وہ چلی جائے گی تو کل خالی گھنٹہ ہوگا اور میں کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوں گا تو کون میرے پاس آئے گا۔ آج ارمل نے معلوم نہیں کس رنگ کے کپڑے پہنے ہوں۔ شاید کل والے سفید کپڑے پہنے ہوں۔ یا شاید کالج کا ڈریس پہنا ہو۔ یا...... شاید...... اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ایک عجیب سارنگ اس کے ذہن کے پردے پر چمکا اور بجلی کی طرح غائب ہو گیا۔ یہ کون سارنگ میں نے سوچا تھا ابھی؟ اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔ تبھی سامنے سے جیپ آتی نظر آئی۔

ارمل آرہی ہے۔ ارمل آرہی ہے۔

ارمل چلی جائے گی ارمل چلی جائے گی۔ پھر وہ یہاں نہیں آئے گی

پھر وہ یہاں نہیں آئے گی۔ پھر وہ کبھی نہیں آئے گی۔ اس کے پاپا جی بڑے کوتوال ہو گئے ہیں۔

وہ بے خیالی میں بیچوں بیچ سڑک پر آکر کھڑا ہو گیا۔ جیپ ایک جھٹکے سے رکی۔ تھانے دار صاحب خود چلا رہے تھے۔ ان کی بیوی ان کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ پپّو اور ارمل پچھلی سیٹ پر تھے۔

ارمل نے کس رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اس نے غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔

تھانے دار صاحب نے گاڑی سے اتر کر اس کے پاس آکر اسے کنارے کیا اور کہا۔ "تم گھر نہیں آئے۔ ارمل تمہاری راہ صبح سے دیکھ رہی تھی"۔

وہ ارمل کے پاس گیا۔ کچھ لمحوں تک خاموش ساکت کھڑا رہا۔ ارمل نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر اس کی طرف غور سے دیکھا۔

اس نے دونوں کاپیاں اس کے ہاتھ میں دے دیں۔ وہ خوشی سے کھل اٹھی۔

"ارے میں تو سمجھی تھی تم بھول گئے ہو گے۔"

"نہیں۔ رات کو ہی سب کام پورا کر لیا تھا۔ میں نے سوچا تم کالج آؤ گی" ۔ ارمل نے کس رنگ کے کپڑے پہنے ہیں؟ اس نے پھر دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے ارمل کے چہرے کے علاوہ کوئی رنگ نظر نہیں آیا۔

تھانے دار صاحب کی بیوی نے بلا کر اسے پیار کیا۔ پپو نے ہاتھ ملایا۔

تھانے دار صاحب نے سر پر ہاتھ رکھا۔ ارمل نے ہاتھ جوڑ کر ہولے سے نمستے کیا۔ اس نے دھیرے سے جواب دیا۔ ابا نے بتایا تھا کہ کافروں کو نمستے یا سلام کرتے وقت ہاتھ نہیں جوڑنے چاہئے۔

"اچھا بیٹے ارشد اب چلتے ہیں۔ ٹرک بہت آگے نکل گیا ہو گا۔ اندھیرا ابھی ہو رہا ہے۔ اب تم گھر جاؤ۔ خوب دل لگا کر پڑھا کرنا۔ اب تم جلدی سے بڑے ہو جاؤ تب ملاقات ہو گی۔" اسے لگا جیسے وہ گر پڑے گا۔ اس نے زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے۔

جیپ اسٹارٹ ہوئی۔ پپو اور ارمل اسے دیکھتے رہے۔ وہ ارمل کو دیکھتا رہا۔ ارمل نے کس رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ کیا یہ نیلا رنگ ہے یا گلابی جوڑا ہے۔ نہیں یہ تو اسکول کا ڈریس لگ رہا ہے۔ یا مجھے لگتا ہے کہ وہی کل والا سفید لباس پہنے ہے۔ جیپ کچے دگڑے پر آہستہ آہستہ دوڑ رہی تھی، دور ہو رہی تھی۔ ارمل چھوٹی ہوتی جا رہی تھی، دھندلی ہوتی جا رہی تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ درختوں کے سائے سے جیپ نکلی تو ساری سواریاں صاف نظر آنے لگی تھیں۔ پھر درختوں کی چھاؤں میں صرف جیپ کا ہیولہ نظر آیا۔ درختوں کے سائے سے جیپ نکل کر اور آگے بڑھی تو اس نے بہت غور سے گیلی گیلی آنکھوں سے ارمل کو دیکھا۔ ابھی ابھی اسے معلوم ہوا کہ ارمل نے ایک ایسے خاص رنگ کا لباس پہن رکھا ہے جسے اس نے کہیں دیکھا ہے۔ دھندلے آسمان کے پس منظر میں ڈوبتے سورج کی ترچھی زرد کمزور کرنوں میں وہ رنگ آہستہ آہستہ اڑتا ہوا دور ہو رہا تھا، کھو رہا تھا۔ جب جیپ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو پیچھے سے کسی نے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ بڑا اس کے پاس کھڑا تھا۔

''چچا شکار سے لوٹ کر تمہیں پوچھ رہے تھے۔ ابا نے کہا کہ آج وہ کالج سے واپس ہی نہیں ہوا۔ مجھے ڈھونڈنے بھیجا ہے۔ تم گراؤنڈ پر نہیں گئے؟''

''نہیں گیا۔ کسی سے کیا مطلب'' اس نے ہمیشہ کی طرح روکھا جواب دیا لیکن آج اس کے لہجے میں تیزی نہیں تھی۔

''گھر واپس چلو۔'' بڑے نے عجیب سی آواز میں کہا۔

''چلو'' جیسے وہ مقابلہ کرنے کی دعوت دے رہا ہو۔

لیکن وہ سہم بھی گیا تھا جیسے بڑے نے اسے چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔

گھر میں داخل ہوا تو آنگن میں بندوقیں رکھی ہوئی تھیں اور زمین پر پرندوں کا ڈھیر تھا۔

''کہاں رہ گئے تھے ارشد'' دیکھو آج شیرازی مار کر لائے ہیں۔ چچا میاں نے ایک بڑی سی سفید بطخ اٹھا کر کہا۔ شام کے دھندلکے میں اسے وہ پرندہ بالکل سفید نظر آیا صرف گردن پر ذبح کی جگہ سرخ نشان تھا۔ قریب آ کر اس نے دیکھا تو شیرازی کے سر پر کاسنی پر تھے جن کے نیچے گلابی چونچ تھی۔

''کل صبح پھر شکار پر جائیں گے۔'' چچا میاں اس سے بولے۔

''مجھے لے چلیں گے۔؟'' اس نے بہت مضبوط لہجے میں آہستہ سے پوچھا۔

''ارشد بیٹے تم ضدی بہت ہو۔ کہہ دیا ذرا بڑے ہو جاؤ پھر چلا کرنا۔'' چچا میاں اسے سمجھانے والے انداز میں بولے۔

اس نے ایک نظر بندوقوں کی طرف دیکھا۔ فرش پر پڑی شیرازی کو دیکھا اور بغیر کچھ کہے امی کے پاس جا کر کہا۔

''حلوہ کھاؤں گا اور صرف میرے لئے بنانا۔'' وہ ایک عجیب سی آواز میں بولا۔

بڑا چولہے پر ہاتھ تاپ رہا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے ارشد کی طرف دیکھا۔ پھر امی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ بیٹھا ہاتھ تاپتا رہا۔

ارشد نے کالج کا ڈریس اتارا اور لحاف میں جا کر لیٹ گیا۔

ابا مغرب کی نماز کے بعد جب واپس ہوئے تو خلاف معمول اتنی جلدی اسے سوتا دیکھ کر اس کے پاس آئے۔

''کیا بات ہے کیا طبیعت خراب ہے۔؟''

"نہیں۔" اس نے بہت روکھا سا جواب دیا۔

ابا خاموش رہے۔ انہیں معلوم تھا کہ جب لڑکے بڑے ہونا شروع ہوتے ہیں تو ایسے ہی روکھے اور ٹیڑھے جواب دیتے ہیں۔ کھانے کے ساتھ امی نے حلوہ لا کر دیا۔ اس نے غور سے امی کی طرف دیکھا۔ امی کے بالوں کی ایک لٹ سفید ہو گئی تھی اور آنکھوں کے کونوں کے پاس ہلکی ہلکی لکیریں پڑنے لگی تھیں۔

"اماں" اس نے بہت ہولے سے پکارا

"ہاں! کیا بات ہے؟"

"حلوہ کسی اور کو تو نہیں دیا ہے۔"

اتنا بہت سا تو تمہیں دے دیا پھر بھی پوچھ رہے ہو۔"

اس نے دوسرے پلنگ پر بیٹھی رضیہ کی پلیٹ میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ وہاں اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا۔

"اماں" اس نے پھر ہولے سے پکارا۔

"ہاں۔ بولو"

"تم ہم سب میں سب سے زیادہ کسے چاہتی ہو؟" اس نے ماں کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

تم بہت ڈھیٹ ہو ارشد۔ میں سب کو برابر سے چاہتی ہوں۔ اگر میں کہہ دوں 'تمہیں' تو رضیہ بیٹھی ہے وہ کیا سوچے گی کیا اسے بازار سے مول لیا ہے۔ اگر بڑا سنے گا تو کیا کہے گا۔ کیا اسے سڑک سے اٹھا کر لائے ہیں۔"

"لیکن اماں۔ تمہیں تو سب سے زیادہ میں چاہتا ہوں۔"

"سارے بچے ماں کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ کتنی تکلیفیں اٹھا کر اماں بچوں کو پالتی ہے۔"

"تم ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی ہو یہ صاف صاف کیوں نہیں بتاتیں کہ سب سے زیادہ کسے چاہتی ہو۔ تمہارے بچوں میں سب سے اچھا کون ہے؟"

ماں نے اپنے چھوٹے بیٹے کے ضدی چہرے کو دیکھا۔ اُن کے چہرے پر غصے اور بے بسی کی کیفیت آئی اور گزر گئی۔

"مجھے پیاس لگی ہے۔ میں پانی پینے جا رہی ہوں۔" وہ گھڑونچی کی طرف مڑیں۔ ابا باہر

تھے۔ چچا پرندے بانٹنے پڑوس میں چلے گئے تھے۔ اور وہ آہستہ آہستہ مرے مرے دل سے کھانے کے لقمے توڑتا رہا۔

بڑا دالان میں سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی جسے وہ ارشد سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ بلب کے نیچے سے گزرا ارشد کو نظر آ گیا کہ پلیٹ میں کیا ہے۔

"اماں" وہ اتنی وحشی آواز میں چلایا کہ رضیہ کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ پڑا۔

"ادھر آؤ تم"

امی کٹورا اٹھائے بھاگتی ہوئی آئیں۔ انہوں نے ابھی پانی انڈیلا ہی تھا، پیا نہیں تھا۔ اس کے پاس آ کر بولیں۔ "کیا بات ہے"۔ اور منہ سے تانبے کا کٹورا لگا لیا۔ وہ شام سے پیاسی تھیں۔

اس نے پلنگ سے اٹھ کر پوری طاقت سے اماں کے ہاتھوں میں تھامے ہوئے تانبے کے کٹورے پر دونوں ہاتھ مارے۔

ایک تیز کراہ کے ساتھ اماں پیچھے کو الٹ گئیں۔ ان کا چہرہ خون میں نہا گیا تھا۔ آگے کے سارے دانت ہل گئے تھے۔ رضیہ اور بڑے نے دوڑ کر اماں کو اٹھایا۔ بڑا اماں کے چہرے سے خون صاف کرنے لگا۔ رضیہ نے دیوانوں کی طرح ارشد کو گھونسوں سے مارنا شروع کر دیا۔

ماں نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔

"سنو رضیہ۔ ابا کو نہ معلوم ہو۔" اور پھر درد کی شدت سے آنکھیں بند کر لیں۔ بڑے نے خون اگلتی آنکھوں سے ارشد کی طرف دیکھا اور ماں سے کہا کہ وہ کلیاں کر کے پلنگ پر لیٹ جائے۔

ارشد بے حس و حرکت پلنگ پر ویسا ہی کھڑا رہا۔ اچانک اسے جانے کیا ہوا کہ وہ بھاگ کر آنگن میں آیا۔ بندوقیں ابھی تک آنگن کے پلنگ پر پڑی تھیں۔ وہ دیوانوں کی طرح بندوقیں اٹھا اٹھا کر پختہ فرش پر پٹخنے لگا۔ جب بندوقوں کے بٹ کی لکڑی کی پچڑیں اکھڑ گئیں تو اس نے بندوقیں اٹھا اٹھا کر دور پھینکنا شروع کر دیں۔ جب چاروں بندوقیں پھینک چکا تو جس پلنگ پر بندوقیں رکھی تھیں اسے اٹھا کر الٹ دیا اور پکے فرش پر ننگے پیر بھاگتا ہوا اندھیری ڈیوڑھی سے نکل کر چوک کو پار کر کے پھاٹک سے نکل کر درگاہ شریف کی دیوار سے ٹیک لگا کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

کئی دن تک امی اور ابا سرگوشیاں کرتے رہے۔ دھوبی کو روزانہ تاکید کی جاتی رہی کہ

ارشد کے کپڑے جلد از جلد دھو کر لادے۔ ارشد ٹوہ میں رہا کہ کچھ معلوم ہو سکے کہاں کی تیاری ہے لیکن امی اور ابا اسے دیکھتے ہی خاموش ہو جاتے۔ بڑا اسے دیر تک دیکھتا مغموم آنکھوں سے کچھ سوچتا رہتا۔ امی نے ابا کو بتایا تھا کہ وہ باورچی خانے میں گر پڑی تھیں۔ نعمت خانے کی نُکر سے ٹکرا کر دانت ٹوٹ گئے۔ لکھنؤ جانے سے ایک دن پہلے ابا نے اسے بلا کر پلنگ پر اپنے پاس بٹھایا۔

"لکھنؤ میں ایک اسکول ہے۔ لا مارٹینیر۔۔ وہاں عیسائی پادری ہیں اور عیسائی عورتیں پڑھاتی ہیں۔ تمہارا داخلہ وہیں کرایا جارہا ہے۔ صبح کو جب وہ دعا پڑھیں تو تم خاموش کھڑے رہا کرنا اور اللہ تعالیٰ کو حضرت عیسیٰ کا باپ مت کہنا۔ سمجھے۔؟

"جی۔ ابا ! !"

"کچھ مت بولو۔ نہیں۔ ایک لفظ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں تمہاری ماں کو بالکل چین نہیں ہے۔ چھٹیاں ہوں گی تو میں بلوالوں گا۔" اس کا سر جھکا ہوا تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ابا کی نظریں سیدھی اس کے سر پر پڑ رہی ہوں گی۔ اس نے آنکھ اٹھانے کی بہت کوشش کی مگر پلکیں آپ ہی آپ نیچے جھکی جارہی تھیں۔

لکھنؤ میں کوئی نہیں ہو گا۔ امی یہیں رہیں گی۔ بڑا یہیں رہ جائے گا۔ رضیہ بھی وہاں نہیں ہو گی۔ ابا بھی نہیں ہوں گے۔ صرف میں وہاں بھیجا جارہا ہوں۔ ضرور امی نے ابا سے چغلی لگائی ہو گی۔ یا ہو سکتا ہے بڑے نے ابا کے کان بھرے ہوں۔

وہ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا چچا کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بندوق کا بٹ ٹھیک کر رہے تھے۔ انہوں نے اس کی طرف سخت نگاہوں سے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

امی نے چچا سے کہا تھا کہ بندر نے بندوق والا پلنگ الٹ کر بندوقیں ادھر ادھر پھینک دی تھیں۔

"اب جب تم پڑھ لکھ کر آؤ گے تب تمہیں شکار لے چلیں گے۔" چچا نے جیسے اسے دلاسہ دیا ہو۔

"کب تک آجاؤں گا چچا میاں"

"پانچ سال بعد۔ پھر تمہیں یونیورسٹی پڑھنے بھیج دیں گے۔"

"اتنے دن میں تو ساری مرغابیاں ختم ہو جائیں گی چچا۔" اس نے دکھ کے ساتھ کہا۔

"نہیں۔" وہ ہنسے۔ "یہ پرندے ہر سال پہاڑوں سے آتے ہیں۔ کچھ یہاں مارے جاتے ہیں۔ باقی واپس چلے جاتے ہیں۔ واپس پہنچ کر اپنے انڈے سیتے ہیں جنہیں برف میں دبا کر میدانوں کی طرف آئے تھے۔ ان انڈوں سے نئے بچے نکل آتے ہیں۔ یہ پرندے پھر اتنے کے اتنے ہو جاتے ہیں۔"

"چچا میاں"

"ہوں۔"

"لامانٹیئر میں عیسائی پادری مسلمان بچوں کو عیسائی بنا لیتے ہیں؟" اس نے آخری ہتھیار استعمال کیا۔

"ہاں ان سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ باتوں ہی باتوں میں دل موہ لیتے ہیں"۔

اس کا دل چاہا کہ چچا سے کہے کہ ابا سے کہہ کر ان کا فیصلہ بدلوا دیں لیکن ابا اپنے فیصلے کبھی نہیں بدلتے۔ چچا میاں ابا سے کہیں گے ہی نہیں۔

اس نے اپنے اندر ایک انجانا خوف اور ایک عجیب طرح کی ہمت ایک ساتھ محسوس کی۔

بڑا پلنگ پر خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"ارشد۔ تمہارا یہاں رکنے کو جی نہیں چاہ رہا؟"

اس نے بڑے کی طرف دیکھا جیسے اس کی آنکھوں میں سچ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ بڑے کی آنکھوں میں کوئی جذبہ نہیں تھا، صرف سوال تھا۔

ارشد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے تمہیں دینے کو کئی چیزیں جمع کی ہیں۔ لے آؤں؟

"ہاں"

بڑا تیزی سے اٹھا اور اندر والی کوٹھری سے ایک ڈبا لا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

اس نے ڈبہ کھولا۔

ڈبے میں تھوڑی سی ٹافیاں، ایک خوبصورت سنہرے رنگ کا پین، بناکا کے ٹیوب سے نکلے ہوئے بہت سے پلاسٹک کے کھلونے جو بڑے نے بہت دن سے جمع کیے تھے اور ایک چھوٹی سی کپڑے کی پوٹلی۔

''اس پوٹلی میں کیا ہے؟''

''کھول کر دیکھ لو۔'' بڑا مسکرایا۔

اس نے پوٹلی کھولی۔ سفید اور پیلی بہت سی اکنیاں جگمگا اٹھیں۔ وہ بہت دیر تک یہ سب چیزیں دیکھتا رہا۔

''یہ سب تمہیں بہت پسند تھا نا؟'' بڑے نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اس کا دل چاہا کہ وہ بڑے سے کہے کہ مجھے تو اپنے گھر رہنا بھی بہت پسند تھا۔ جب گرمیوں کی چمکیلی صبح آنکھوں کے پپوٹے گدگداتی تھی اور آنگن کے کھجور پر مینائیں شور مچا کر جگا دیتی تھیں تو پلنگ سے اٹھ کر بھاگ کر پکی پکی کھٹی کھجوریں بیننا بھی مجھے بہت پسند تھا۔ میں نے آج دو گول مارے ہیں، یہ بات ابا کو بتانا بھی بہت پسند تھا کہ یہ سننے کے بعد وہ کچھ کہتے نہیں تھے لیکن کن انکھیوں سے مجھے دیکھتے رہتے تھے۔ امی کی گود میں سر رکھ کر دیر تک لیٹے رہنا بھی مجھے بہت پسند تھا۔ لیکن تم سب مل کر مجھے دور بھیج رہے ہو۔ اس نے کچھ کہا نہیں۔ چپ چاپ سنہرے پین اور چمکیلی اکنیوں کو دیکھتا رہا۔

''ارشد۔ اب میں اکیلے اسکول جایا کروں گا''

''ہاں'' ارشد نے بہت مختصر سا جواب دیا۔

ارشد چپ چاپ اٹھا۔ اندر جا کر اپنے ٹین کے ہرے بکسے میں ڈبہ رکھا اور نیچے ہاتھ ڈال کر ایک چیز نکالی، آنگن میں آ کر وہ چیز بڑے کے ہاتھ میں رکھ دی

''یہ اپنے پاس رکھ لو۔ جب میں واپس آؤں گا تو لے لوں گا۔ بالکل سے نہیں دے رہا ہوں۔''

بڑے نے ہتھیلی پر شیشے کے اس رنگین جھل مل جھل مل کرتے ٹکڑے کو دیکھا جسے مانگ مانگ کر وہ تھک چکا تھا۔

بڑے نے اسے ہتھیلی پر رکھ کر دیکھا۔ شیشے کا وہ چوکور ٹکڑا دھوپ میں جھلملانے لگا اور سفید دیوار پر اس کی ست رنگی چھوٹ اوپر نیچے ڈولنے لگی۔

امی برقع پہنے ارشد کی انگلی تھامے پرنسپل سے گفتگو کرتی رہیں۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ جب عیسائی عورت اس سے گفتگو کرے تو وہ اسے 'میڈم' کہہ کر مخاطب کرے۔ عیسائی پادری سے بات کرتے وقت 'فادر' کہنا تھا۔

"نہیں۔ آپ بس اتوار کو مل سکتی ہیں۔ چھٹیوں میں یہ گھر بھی جا سکتا ہے۔" ارشد امی کا ہاتھ چھوڑ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ چھوٹا سا کوٹ پہنے نیلی ٹائی لگائے اسی عمر کا ایک لڑکا باہر کھڑا ہوا تھا۔

"کون سے کلاس میں پڑھتے ہو؟"

"سیونتھ"

"ہمارا بھی داخلہ ساتویں میں ہوگا۔ تمہاری امی ابا کہاں رہتے ہیں؟"

"نینی تال"

"یہ کہاں ہے، اتر پردیش میں ہے؟"

"یس۔ ہل ایریا۔ تم وہاں کبھی نہیں گئے۔ پلین سے بہت سارے لوگ سمر میں آتے ہیں۔"

"ہر سال پہاڑ سے پرندے آتے ہیں۔ میدانوں کی گرمی حاصل کرنے۔ پھر موسم ختم ہو جاتا ہے اور یہ واپس پہاڑ پر چلے جاتے ہیں۔" چچا نے بتایا تھا۔

چلتے وقت امی نے اس کی جیب میں ایک ایک کے بہت سے نوٹ بھر دئے ۔ امی کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ٹپکے۔

"امی"

"کیا ہے؟"

"امی تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔ بس چھٹیوں چھٹیوں میں مجھے بلایا کرو گی۔ ہیں امی؟ بس اتنی سی بات پر کہ تم سب سے زیادہ کسے چاہتی ہو"

امی کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو گرنے لگے۔

وہ واپس پرنسپل کے کمرے میں گئیں اور روتے روتے اس کا سامان واپس منگایا۔

ریل کی کھڑکی سے اس نے سر نکال کر دیکھا۔ گھر کا اسٹیشن آ رہا تھا۔

ریل پٹری بدل رہی تھی۔ دور مسجد کے سفید گنبد نظر آ رہے تھے۔ کھیتوں کی مٹی کا سانولا رنگ، سرسوں کا پیلا رنگ، جاڑے کی دھوپ کا سنہرا رنگ، درختوں کا سبز رنگ اور آسمان کا نیلا شفاف رنگ۔ سب اتنے اچھے لگے کہ اس نے امی کی گود میں سر رکھ کر اپنے خوشی کے آنسو چھپا لئے۔

رکنے سے پہلے ریل نے تیز سیٹی بجائی، ڈھیر سا دھواں اگلا اور ایک جھٹکے سے رک گئی۔ رکشے والے انہیں دیکھ کر اسٹیشن کی تاروں کی باؤنڈری پھلانگ کر تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔

☆☆☆

"غزالہ آپا میں نے اس سے انگریزی میں کہا کہ میں پہاڑ سے نہیں آیا ہوں۔"

"اچھا!" غزالہ آپا نے حیرت سے کہا اور دروازے کی طرف دیکھا۔

"ہاں! غزالہ آپا۔" ارشد نے جھوٹ بولا

"سچی تم جس وقت گئے تو مجھے بہت رونا آیا۔ لیکن تمہاری امی کے مارے میں تمہیں چھوڑنے نہیں آئی۔"

"کیوں امی سے کیا بات ہو گئی۔"

"وہ تمہیں منع نہیں کر رہی تھیں کہ تم غزالہ آپا کے ساتھ اندر والے کمرے میں مت کھیلا کرو۔"

ارے ہاں۔ اسے اچانک یاد آیا۔ اس نے جانے کیوں غزالہ آپا کی شال کو دیکھا۔ غزالہ آپا نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر خوب دیر تک چوما۔ اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ ہڑبڑا گیا۔ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ اسی طرح اُن کے ساتھ بیٹھا رہے مگر امی کے آنے کا ڈر تھا۔ وہ منع کرتی ہیں۔ کچھ نہ کچھ ایسی بات ہے جو سب باتوں سے مختلف ہے۔ اسے احساس ہے کہ جب غزالہ آپا اس کے ساتھ اکیلے میں ہوتی ہیں تو سب چیزیں اسے مختلف لگنے لگتی ہیں۔ دروازے چھوٹے چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ آئینہ تیزی سے چمکنے لگتا ہے۔ شال میں عجیب سی گنگنی مہک محسوس ہونے لگتی ہے۔ تخت گرم گرم محسوس ہونے لگتا ہے۔ اور غزالہ آپا کے کانوں کی لویں سرخ ہو کر اندھیرے میں چمکنے لگتی ہیں۔

یہ کیا ہوتا ہے...... امی سے پوچھوں تو وہ ڈانٹنے لگیں گی۔

"غزالہ آپا! امی آپ کے پاس آنے سے کیوں روکتی ہیں۔"؟

غزالہ آپا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"تم نے کچھ بتایا تو نہیں ان سے؟

"نہیں۔ کیا بتاتا؟"

"کچھ نہیں۔ تمہاری امی نہیں چاہتیں کہ تم مجھ سے محبت کرو۔"

"کیوں نہ کروں محبت۔ آپ تو ہماری بہن ہیں۔ نہیں؟"

"ارے نہیں بھئی۔ ہم اور تم ویسی والی محبت کرتے ہیں۔"

"ویسی والی کیسی؟" آج اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ پوچھ کر رہے گا۔

"ویسی جیسے لڑکی لڑکے کرتے ہیں۔"

"تو بہن بھائی لڑکی لڑکے نہیں ہوتے۔"

"ارے تم بالکل گدھے ہو۔ جیسی فلموں میں ہوتی ہے۔"

ارشد کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ یہ بات اسے مزید ارلگی اور ساتھ ہی ساتھ یہ احساس بھی ہوا کہ وہ ایک خاص چیز بنتا جا رہا ہے۔ مگر اب بھی اس کی سمجھ میں سب کچھ نہیں آرہا تھا۔

"تو کیا میں بندوق سے آپ کے دشمن کو مار کر آپ سے شادی کروں گا۔ ہیں غزالہ آپا! کیا میری آپ سے شادی ہو گی؟"

غزالہ آپا نے اس کی حیرت سے پھیلی آنکھوں میں جھانکا اور خاموش ہو گئیں۔

اس نے ان کا ہاتھ پکڑا اور ہولے سے پوچھا۔

"غزالہ آپا کیا آپ کی مجھ سے شادی ہو گی۔"

تب وہ بہت مشکل سے بولیں۔ وہ دکھی ہو گئی تھیں۔

"تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو۔ ایک دو سال کا فرق ہوتا تو ہو جاتی۔ بالکل سچ بتانا ارشد۔ کیا تمہارا دل چاہتا ہے کہ میں تمہاری دلہن بنوں۔" ارشد نے ان کے سفید ٹھنڈے ہاتھوں کو دیکھا جو دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔

اس نے یہ بات کبھی سوچی بھی نہیں تھی۔ ابھی تو مجھے پڑھ لکھ کر ملازمت کرنا ہے۔ بڑا آدمی بننا ہے۔ پھر بڑے کی شادی ہو گی تب میری شادی ہو گی۔ ابھی تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ غزالہ آپا آپ تو بہت بڑی ہیں۔ میں اتنا چھوٹا ہو کر آپ کا دولہا بن کر کیسا لگوں گا۔

ارشد نے غزالہ آپا کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ چاہتی ہیں کہ میں کہہ دوں کہ ہاں آپ کو دلہن بنانے کو جی چاہتا ہے۔

"لیکن غزالہ آپا۔ آپ کا دولہا تو جو بھی ہو گا بہت بڑا ہو گا۔"

"ہاں۔" وہ چپ ہو گئیں۔ کھڑکی کے باہر فرش پر سوکھے پتے آہستہ آہستہ گر رہے

تھے۔ باہر دور تک نگاہیں دوڑاتے ہوئے غزالہ آپا نے سوچا آج کل موسم بہت سخت ہے۔ اور ہر موسم بہت سخت ہوتا ہے اور انتظار کا موسم بہت زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اور غیر معین انتظار کا موسم سب سے ہی زیادہ سخت ہوتا ہے۔

ارشد نے ان کی نظروں کا پیچھا کیا اور کھڑکی کے باہر سرد ہواؤں کو گزرتے ہوئے سنا۔ اور ہواؤں کے اس پار بڑے پھاٹک کے ادھر دور دور تک پھیلے ہوئے خاموش کھیتوں کے اس طرف ایک رنگ چمکتا ہوا دیکھا جو فوراً ہی غائب ہو گیا۔

"اے غزالہ آپا! آپ نے دیکھا ادھر ایک رنگ چمکا تھا۔"

"رنگ۔ رنگ چمکا تھا۔ کیسا رنگ؟" انہوں نے دور کھیتوں کی طرف دیکھا۔

"وہاں کھیتوں کے ادھر۔ میں نے وہ رنگ پہلے بھی ایک دن دیکھا تھا۔ کس دن دیکھا تھا ابھی آپ کو بتا رہا ہوں۔"

وہ سوچنے لگا۔ اس نے ذہن پر بہت زور ڈالا لیکن یاد نہیں آیا۔

"غزالہ آپا!"

"ہاں"

"غزالہ آپا! ایک رنگ چمکتا ہے۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ پھر غائب ہو جاتا ہے کیا کوئی جنات وہ رنگ دکھاتا ہے۔"

"اے بھیا... ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔" انہوں نے کھڑکی بند کر دی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ جب آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں تو انہوں نے دیکھا کہ موٹی موٹی آنکھوں والا ارشد کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ اسے اتنا متفکر دیکھ کر انہیں اس پر بڑا پیار آیا۔

کیا میں سچ مچ اپنے پڑوس کے اس لڑکے سے محبت کرنے لگی ہوں۔ انہوں نے اپنے دل ہی دل میں سوال کیا۔ ادھر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ انہوں نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ارشد نے اس رنگ کو یاد کرنے کی پھر کوشش کی۔ ارشد نے دیکھا غزالہ آپا اس کے ہاتھوں کو پیار کر رہی ہیں۔

"غزالہ آپا۔ ارمل کے باپ آئے تھے۔ تھانے دار صاحب؟"

"نہیں تو۔ اور تم یہاں سے باہر ہی کتنے دن رہے۔ تین چار دن ہی میں تو واپس ہی

آگئے۔"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔

رات کو سوتے سوتے آنکھ کھلی۔ ابا امی سے کہہ رہے تھے۔

"میں نے زمین داری والے بانڈ ڈاک خانے میں جمع کردئے ہیں۔ ان دونوں کی تعلیم کی طرف سے کوئی فکر نہیں ہے۔ میرے بوڑھے ہونے سے پہلے ہی یہ دونوں اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ"

امی خاموش رہیں

"تم ارشد کو لکھنؤ سے واپس لے آئیں۔ بلاوجہ تین چار سو کی چپت پڑ گئی" امی کچھ دیر چپ رہیں پھر بولیں۔

"وہاں سے یہ عیسائی بن کر نکلتا۔ وہاں کا رنگ ڈھنگ مجھے پسند نہیں آیا۔ اس لئے لے آئی۔"

"فیس تو کم از کم واپس لے آتیں۔"

"وہاں فیس کی واپسی کا قاعدہ نہیں ہے۔ لعنت بھیجو فیس پر۔ ایمان تو لاکھوں میں بھی نہیں مل پاتا۔"

"یہ تو سچ کہتی ہو۔ اور پھر اپنا بچہ اپنے ہی سامنے رہے تو سکون رہتا ہے۔"

پھر اماں نے رکی رکی آواز میں کہا۔

"کتنے دن تک؟۔ اب کم بخت بڑے ہو رہے ہیں۔ دسواں کرکے یونیورسٹی چلے جائیں گے۔"

"خدا وہ دن تو لائے۔ تم رنجور نہ ہو میں اتوار اتوار بلالیا کرونگا۔"

"کوئی نہیں آئے گا اتوار اتوار۔ وہاں جا کر سب کو وہاں کی فضا راس آجاتی ہے۔"

"خیر اب سو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ انہیں نیک توفیق دے۔"

ارشد لحاف میں منہ چھپائے بہت دیر تک سوچتا رہا کہ بچے پاس ہوں تو سکون کیوں ملتا ہے۔ بچوں کے دور جانے سے کس بات کی تکلیف ہوتی ہے۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔

اندھیرے میں اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اسے روشن اور دھندلے بہت سے زاویوں والے ڈھیر سارے خاکے نظر آئے۔ ان خاکوں سے وہ کھلونے کے ٹکڑوں کی طرح

عمارتیں بنانے لگا۔ پھر وہ روشن خاکے آہستہ آہستہ دھندلے ہوتے گئے اور اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگیں۔

☆☆☆

یہ غزالہ آپا بھی عجیب ہیں۔ مجھے مانجھے میں اپنے پاس بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب میں چھوٹا تو ہوں نہیں۔ یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔ وہ ویسا ہی بچہ سمجھ رہی ہیں۔

ارشد نے یہ سوچا ضرور لیکن اس کا دل بے ساختہ چاہا کہ رات ہونے سے پہلے ہی غزالہ آپا سے ملنے مانجھے کے کمرے میں چلا جائے لیکن وہاں ایسی چیخ پکار مچی ہوئی تھی کہ توبہ بھلی۔ دور نزدیک کے سارے عزیز شادی میں شرکت کرنے آچکے تھے۔ نوجوان لڑکیاں غزالہ آپا کو ہر وقت گھیرے رہتیں۔

بڑا اور وہ شادی میں شرکت کرنے چھٹی لے کر آئے تھے۔ ارشد نے اس بار ابا کے بالوں میں بہت سے سفید بال دیکھے۔ اس کا دل بہت اداس ہوا تھا۔ بڑا اب اور سنجیدہ ہو چکا ہے۔ اس سے کچھ پوچھو تو وہ دس باتیں غم پیدا کرنے والی اور بتا دے گا۔

"اماں۔ ابا اتنے بوڑھے کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔؟"

"اماں نے اپنے جوان ہوتے بیٹے کو دیکھا جس کی طرف سے ہمیشہ خلش رہتی تھی کہ یہ کبھی اپنے ماں باپ کے بارے میں نہیں سوچتا۔

" ہم سب کی اتنی ساری ذمہ داریوں کا بوجھ ہے نا ان پر۔ " اماں سے اسی قسم کے جواب کی امید تھی۔

"چھ سال بعد میں کمانے لگوں گا تو سب ذمہ داریاں ختم ہو جائیں گی۔ پھر تو ٹھیک رہے گا نا اماں؟"

بڑے نے آکر اماں کو ایک سونے کی انگوٹھی دکھائی جو ایک آبنوسی ڈبے میں رکھی تھی۔

"یہ میں غزالہ آپا کی شادی میں دوں گا" بڑا انگوٹھی دیکھتا ہوا اماں سے بولا۔

یہ بڑا اماں سے کوئی بات ہی نہیں کرنے دیتا۔ بچپن سے اس کی عادت ہے۔ بس بیچ میں آکر بول پڑے گا۔

"ہاں۔ یہ بہت خوبصورت ہے۔ کتنے کی ملی۔"

"دو سو روپے کی"

کہاں سے آئے پیسے؟" ارشد نے مشکوک نگاہوں سے بڑے اور اماں کی طرف دیکھا۔

"بچائے تھے اپنے جیب خرچ سے۔"

"میں تو کبھی نہیں بچا پایا۔"

"تم زیادہ خرچ کرتے ہو۔"

خرچ تم بھی خوب کرتے ہو۔ یہ کہو کہ اماں نے تمہیں چپکے سے دے دیئے ہوں گے۔"

"نہیں ارشد۔ خدا کی قسم میں اپنے پاس سے لایا ہوں۔"

"قسم جھوٹے کھاتے ہیں۔"

"اچھا چپ رہو۔" اماں غصہ ہو کر بولیں۔ "مجھے اختلاج ہونے لگتا ہے۔ تمہاری باتیں سن کر۔ پڑھ لکھ کر گدھے ہوتے جا رہے ہو۔"

بڑا آبنوسی ڈبیہ اٹھائے ہوئے باہر چلا گیا۔

اماں نے ارشد کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔

ارشد کو بڑی سبکی سی محسوس ہوئی۔ وہ شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اچانک اسے کچھ خیال آیا۔

"اماں او اماں! ادھر دیکھو۔"

"کیا ہے۔"

"اماں تم بڑے کو بہت چاہتی ہو؟"

"تمہیں بھی چاہتی ہوں۔"

اس نے بہت ضبط کے ساتھ یہ جملہ سنا۔ اماں تمہیں یہ نہیں کہنا چاہئے تھا کہ تمہیں بھی چاہتی ہوں۔ مجھے کیا بڑے کے طفیل میں چاہتی ہو۔ تم میری اماں ہو کر نہیں سمجھ پائیں۔ تم کیسی ہو اماں۔ تم نے ہمیشہ مجھے ناامید ہی رکھا۔ کبھی تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم سب سے زیادہ کسے چاہتی ہو۔ سچ کہہ رہا ہوں اماں اگر تم یہ کہہ دو کہ تم سب سے زیادہ بڑے کو چاہتی ہو تب بھی میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ پھر مجھے یکسوئی تو ہو جائے گی کم سے کم۔

وہ سوچتا رہا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔

ارشد نے باہر آ کر گرمیوں کے سورج کو ڈوبتے دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ بہت اکیلا ہے اور غمگین ہے اور بہت خاموش ہے۔ گرمیوں کی شامیں اتنی خاموش نہیں ہوتیں لیکن خاموشی

اس کے وجود کے اندر سما گئی تھیں۔ تب اس نے سوچا کہ صرف غزالہ آپا مجھے ٹوٹ کر چاہتی ہیں اور کوئی نہیں۔ غزالہ آپا کا خیال آتے ہی اسے ڈوبتے سورج کے پاس، شفق کے سرخ رنگ کے اوپر بہت سے رنگ اور بھی نظر آئے۔ اور اچانک اسے وہ رنگ بھی دکھائی دیا جو جھما کا مارتا ہوا ابھی آنکھوں سے اوجھل ہوا تھا۔ یہ رنگ کون سا ہے۔ یہ اتنی کم دیر کے لئے کیوں سامنے آتا ہے۔ یہ کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ اس رنگ سے میرا کیا ناطہ ہے۔ یہ غزالہ آپا کا رنگ نہیں ہے۔ ان کے تو سارے رنگ میں نے دیکھے ہیں۔ جب میں ان کے قریب ہوتا تھا تو میری قربت کی خوشی میں ان کے کانوں کی لویں سرخ ہو جاتی تھیں۔ جب ہم جاڑوں میں پاس پاس بیٹھتے تھے اور وہ میرے ہاتھ تھامے ہوتی تھیں توان کے ہاتھ بالکل برف کی طرح سفید ہوتے تھے۔ جب وہ کسی کی آہٹ سنتی ہیں توان کا رنگ نیلا پڑ جاتا تھا۔ جب میں ان سے کہتا تھا کہ امی مجھے آپ کے پاس آنے سے منع کرتی ہیں تو ان کا چہرہ پیلا پڑ جاتا تھا۔ لیکن یہ رنگ جو میں دیکھتا ہوں یہ کوئی بالکل مختلف رنگ ہے۔ یہ سفید ہے نہ پیلا نہ سرخ نہ نیلا۔ یہ سب رنگوں سے مل کر بنا ہوا کوئی رنگ ہے تبھی تو میں اس کی شناخت نہیں کر پاتا ہوں۔ یہ میرے سامنے آتا ہی کتنی دیر کو ہے۔ آیا اور گیا۔ کیا ارمل نے جانے والے دن اسی رنگ کے کپڑے پہنے تھے۔ لیکن اس کے کپڑوں کا رنگ تو میں دیکھ ہی نہیں پایا تھا۔ جیپ پانچ منٹ کو رکی تھی اور پھر آگے بڑھ گئی تھی۔ درختوں کے سائے میں ہوتی ہوئی دور بہت دور چلی گئی تھی۔ میں ارمل کا لباس دیکھ ہی نہیں پایا تھا۔

اندھیرا ہونے لگا تھا۔ ارشد دھیمے دھیمے قدموں کے ساتھ غزالہ آپا کے گھر میں داخل ہوا۔ سب اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ وہ بے چین بے چین سا بیٹھا اندر والے کمرے کی طرف دیکھتا رہا۔ عورتیں اور بچے زور زور سے باتیں کر رہے تھے اور اپنے اپنے کپڑے سنبھال رہے تھے۔ ایک طرف اسٹول رکھا تھا اور بڑا سا پاندان کھلا ہوا تھا۔

"جاؤ میاں تمہیں بٹیا اندر بلا رہی ہیں۔"

"ارے۔ یہ لڑکے ہو کر اندر مانجھے میں جائیں گے۔" دور سے آئے کسی عزیز کی بیٹی نے گویا پتہ کاٹنے کی کوشش کی۔

"اسے آنے دو۔" غزالہ آپا کی آواز اندر کمرے سے آئی۔ اس آواز میں ارشد کو بہت اپنا پن، بہت گرمی، اور بہت چاہت محسوس ہوئی۔ وہ پیلے کپڑے پہنے اندر اکیلی بیٹھی تھیں۔ ہلدی ابٹن کی تیز مہک چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ان کا چہرہ بہت شفاف نظر آ رہا تھا۔

"میرے پاس آکر بیٹھو۔" انہوں نے کہا۔اور یہ ان کی آواز تھی جن کے متعلق ارشد کو بہت دن بعد معلوم ہو سکا تھا کہ وہ اسے اتنا چاہتی ہیں۔ کمرے میں کوئی اور نہیں تھا۔ غزالہ آپا اس کی اڑی اڑی رنگت اور موٹی موٹی آنکھوں کو دیکھ رہی تھیں۔

"تم کچھ پریشان ہو ارشد"؟

اس نے ان کی گود میں سر رکھ دیا اور خاموش ہو گیا۔

انہوں نے اس کے کانوں کو پکڑ کر ہولے سے شرارت کے ساتھ ہلایا۔اس نے پھر بھی سر نہیں اٹھایا۔انہوں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ پھر اس کا چہرہ اپنی طرف کر کے اس کے ماتھے پر پیار کیا۔اس نے آنکھیں بند رکھیں۔انہوں نے پھر پیار کیا۔اب اس نے آنکھیں کھولیں۔اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا سا چہرہ اس کے چہرے سے اتنا قریب ہے کہ وہ ان کی سانسوں کی گرمی محسوس کر سکتا ہے۔ان کی آنکھوں میں ارشد کو ایک دوست چمک نظر آئی۔اس نے دونوں ہاتھوں سے ان کا چہرہ تھاما، اپنے قریب کیا اور ان کے ہونٹوں کو چوم لیا۔

"ارے" وہ ایک دم سے سرخ ہو گئیں اور خود کو چھڑا لیا۔

وہ ویسا ہی بے خوف لیٹا رہا۔

"آپ تو ہمیشہ پیار کرتی ہیں آج میں نے کر لیا تو آپ گھبرا گئیں۔کیوں گھبرائیں۔" وہ چپ چاپ تھیں۔ پھر مسکرا کر بڑی مشکل سے بولیں۔

"مجھے ابھی پتہ چلا تم بڑے ہو گئے ہو۔ تمہاری مونچھیں ہونٹوں میں کیسی گڑ رہی تھیں۔"

ارشد نے یہ سن کر خود کو پورا مرد محسوس کیا اور اس خوش آیند اطلاع دینے والے کو بہت چاہت بھری نظروں سے دیکھ کر بہت ہمت کر کے اس نے ہولے سے پوچھا۔

"اب بھی آپ کا دل چاہتا ہے غزالہ آپا کہ آپ مجھ سے شادی کریں؟"

"غزالہ آپا اب یہ سن کر مسکرائیں۔

"تم اب بھی مجھ سے بہت چھوٹے ہو۔ارشد تمہیں معلوم ہے وہ ریلوے میں بہت بڑے آفیسر ہیں۔ ہندوستان بھر میں مفت سفر کر سکتے ہیں فرسٹ کلاس میں۔ شادی کے بعد میں بھی مفت سفر کروں گی۔ جہاں جہاں ہم اور وہ چاہیں۔"

وہ کچھ اور بھی کہتی رہیں لیکن وہ باقی باتیں سن نہیں سکا۔اس نے آہستہ سے اپنا سر ان

کے زانو سے ہٹایا اور خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھ کر ان کی طرف خالی خالی نظروں سے تکتا رہا۔

تم بھی دھوکہ دے گئیں غزالہ آپا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ بس تم ہی مجھے ٹوٹ کر چاہتی ہو۔ اور جب میں تم سے پوچھوں گا کہ کیا اب بھی تمہارا دل مجھ سے شادی کرنے کو چاہتا ہے تو تم کہو گی کہ ہاں۔ لیکن گھر والوں کی مرضی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں ورنہ میں تم کو اپنا شریک زندگی مان چکی ہوں۔ پھر تم رو دو گی اور میں تمہاری آنکھوں سے آنسو خشک کر کے تمہارا سر اپنے سینے سے لگا کر تم سے کہوں گا کہ نہ روؤ غزالہ۔ ہم تم ایک دوسرے کو چاہتے رہیں گے۔ ہمیشہ خود کو اپنی محبت میں سرشار رکھیں گے۔ لیکن تم نے تو میری بات بھی سنجیدگی سے نہیں سنی۔

میں تمہیں بتاتا کہ میں فضا میں بہت سے رنگ دیکھتا ہوں اور ان میں ایک عجیب سا رنگ ہوتا ہے جس کی شناخت نہیں ہو پاتی۔ لیکن تم نے تو ریلوے آفیسر کا قصہ چھیڑ دیا۔ تم نے مجھے اتنی جلدی کھو دیا۔ تمہیں تو یاد ہوگا۔ مجھے تو اچھی طرح یاد ہے کہ پہل تمہیں نے کی تھی۔ میں تو اس وقت بہت سی باتیں جانتا بھی نہیں تھا۔

"ارشد اوارشد۔ نازو تمہیں بہت مانتی ہے۔"

وہ ان کی طرف دیکھتا رہا۔

اور تم غزالہ آپا...... تم کتنا مانتی ہو۔ اور یہ نازو مجھے کیوں مانتی ہے۔ کیا وہ بھی کسی کا انتظار کر رہی ہے کہ کوئی ریلوے کا آفیسر یا ہوائی جہاز کا پائلٹ آئے اور اسے بیاہ کر لے جائے اور جب تک وہ نہیں آئے تو دل کو مصروف رکھنے کے لئے میاں ارشد سے ذرا بے تکلفی رہے تو کیا حرج ہے۔ ہیں نا غزالہ آپا۔

وہ اٹھ گیا۔

"ارے ارشد تم جا رہے ہو۔؟"

"ہاں غزالہ آپا۔ میں اب بڑا ہو گیا ہوں نا۔ آپ کے پاس زیادہ دیر تک بیٹھنا کچھ معیوب سا لگتا ہے۔"

گھر آ کر وہ جلد ہی بستر پر لیٹ گیا۔

"کل شادی کے انتظامات میں صبح سویرے ہی مصروف ہو جانا ہے نا۔ اس لئے جلدی سو رہا ہوں۔ کھانا نہیں کھاؤں گا" اس نے امی سے کہا۔

☆☆☆

اور یہ بڑا میدان ہے۔ ارہر کے کھیتوں کے پار ایک نالا ہے۔ اس نالے کے ادھر ایک گاؤں ہے۔ گاؤں کے پیچھے ایک تالاب ہے جس میں سرمائی پرندے تیر رہے ہوں گے۔ آج چچا نے مجھے بتایا کہ میں اب بڑا ہو چکا ہوں بندوق لے کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکار پر جا سکتا ہوں۔

کل غزالہ آپا اپنے شوہر کے ساتھ پھولوں سے لدی کار میں بیٹھ کر اپنے گھر جا چکی ہیں۔ اپنے نئے گھر جانے سے پہلے وہ مجھے مطلع کر چکی ہیں کہ اب میں بڑا ہو چکا ہوں۔

ارشد نے سوچتے سوچتے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ باقی ساتھی بندوقیں تھامے تیز تیز پیچھے آ رہے تھے۔

ابھی آٹھ ہی بجے تھے اور سورج آدھے آسمان پر چڑھ گیا تھا۔

خواہشیں کتنی جلدی خود کو بے قیمت کر دیتی ہیں۔ آج سے آٹھ دس سال پہلے شکار پر آنے کی کتنی شدید خواہش ہوتی تھی۔ دل کہتا تھا کہ بس چچا شکار پر لے تو چلیں پھر ایک ہی جست میں پورا میدان طے کر کے میں نالا پار کروں گا اور نالے کے ادھر گاؤں کے باہر تالاب میں گھس کر مرغابیاں مارونگا۔ جب فائر کی آواز سے اڑیں گی تو اڑتے میں بھی ماروں گا اور سب کو ڈوری سے باندھ کر کاندھے پر رکھ کر جیپ میں جب ہم سب داخل ہوں گے تو سب سے آگے بندوق تھامے میں چل رہا ہونگا۔ اور اوسر کے میدان میں اگر نیل یا ہرن ملے تو للکار کر انہیں روک لوں گا۔ وہ چپ چاپ کھڑے ہو جائیں گے۔ میں دور سے ہی رائفل کا نشانہ لے کر فائر کروں گا اور نیلا دھب سے زمین پر گر پڑے گا۔ باقی نیلے بھاگیں گے تو بھاگتے میں ایک اور مار گراونگا۔ پھر بیل گاڑی پر لاد کر بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ قصبے میں داخل ہوں گے اور راستے میں اپنی جان پہچان والوں سے کہتے آئیں گے کہ رات کا انتظام نہ کیجئے گا میں نیل کا گوشت بھیجونگا۔

اور آج جب میں پہلی بار اپنے ساتھیوں کو لے کر خود شکار پر آیا ہوں تو سب کچھ کتنا بے معنی لگ رہا ہے۔ میں صرف خود کو مصروف رکھنے کے لئے آج شکار پر آیا ہوں۔

کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ارہر کے کھیتوں کے اُدھر اشارہ کیا۔

”وہ ببول کے نیچے جھاڑیاں ہیں یا نیلے ہیں۔؟“

ارشد نے غور سے ادھر دیکھا۔ ہوا میں کچھ گرمی آ گئی تھی اور میدان میں آہستہ آہستہ دھول اڑنے لگی تھی۔ اڑتی ہوئی گرد کو چیرتی ہوئی سب کی نگاہیں دور ان جھاڑیوں کو دیکھتی رہیں۔

اچانک سب نے دیکھا کہ ان میں سے ایک جھاڑی اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔

"ارے نیلے ہیں۔ کئی ہیں۔" کوئی سرگوشیوں میں چلایا تھا۔

"لیکن ادھر کوئی آڑ نہیں ہے۔ مشکل سے مار کھائیں گے۔ سیانے ہیں۔ دیکھو کتنی دور سے دیکھ کر مادہ اٹھ کھڑی ہوئی۔"

تمام ساتھیوں کے چہروں پر شکار کی خوشی امنگ بن کر ناچ رہی تھی۔ پسینے سے شرابور چہرے لئے سب لوگ نیلوں کو دیکھتے رہے۔ تب کسی نے کہا تھا۔

"اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ارشد میاں آپ نالے میں جا کر بیٹھ جایئے۔ آج کل سوکھا ہے۔ ہم لوگ اُس طرف سے گھیرتے ہیں۔ نیلے آپ ہی نالے کی طرف بھاگیں گے۔ جیسے ہی نالے میں اتریں آپ دھر لیجئے گا۔"

ارشد نے تجویز سے اتفاق کیا۔ اور چکر کاٹتا ہوا نالے کی طرف بڑھنے لگا۔

میدان میں آدمیوں کو دیکھ کر وحشی چرندے اُٹھ اٹھ کر کھڑے ہونے لگے اور ایک دوسرے کی طرف پشت کئے وہ ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ ارشد نے ڈرتے ڈرتے کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھا۔ مادائیں اپنے دموں کو تیزی سے گردش دے رہی تھیں اور آہستہ آہستہ زمین پر کھر مار مار کر مٹی اڑا رہی تھیں۔ نالا اب تھوڑی ہی دور تھا۔ ارشد کو کچھ جھاڑیوں کی آڑ مل گئی جن کے سہارے وہ نالے تک پہنچ سکتا تھا۔ اس نے جھاڑیوں کی آڑ لے کر نالے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ نالے میں پہنچ کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ نیلے اب مطمئن سے لگ رہے تھے۔ جب تک ساتھی چکر کاٹ کر نیلوں کا ہانکا کریں گے تب تک میں سانس درست کر سکتا ہوں۔ یہ سوچ کر ارشد زمین پر چت لیٹ گیا اور لیٹے لیٹے بندوق کے کارتوس چیک کئے، بندوق بند کی اور سینے پر رکھ کر شفاف نیلے آسمان کو دیکھ کر انتظار کرنے لگا۔

اور اب تمہارا نیا نویلا پن ختم ہو چکا ہوگا۔ تم ایک رات اپنے نئے گھر میں گزار چکی ہو گی۔ اب تم اپنے شوہر سے صبح کے ناشتے پر کچھ شرما شرما کر گفتگو کر رہی ہو گی اور تمہیں اس کی خبر بھی نہیں ہو گی کہ جسے تم یہاں برباد کر کے گئی ہو وہ اس وقت تپتے ہوئے میدان میں بندوق لئے وحشی جانوروں کا انتظار کر رہا ہے۔

ارشد نے یہ سوچ کر خود کو بہت حقیر سا محسوس کیا اور تلملا کر بندوق پکڑ لی۔

ساتھیوں کی آواز کا تیز شور بلند ہوا۔ نیلوں کی بھگدڑ کی آواز سنائی دی۔ وہ گھٹنوں کے

بل بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ بھاگتا ہوا ایک کالا نیلا نالے میں اترا۔ ارشد نے کاندھے پر بندوق آنے سے پہلے ہی بندوق کی لبلبی دبا دی۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا اور اگلی ٹانگوں کے بل ادھر ادھر ہونے لگا۔ گراب نے ریڑھ کی ہڈی توڑ دی تھی اور یہ چوٹ بہت کاری چوٹ ہوتی ہے۔ جانور پھر بل کر نہیں جا سکتا۔ نالے پر چڑھ کر اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر بلایا۔

"کیا ہوا" کسی نے دور سے چلا کر پوچھا۔

"رہ گیا۔ آؤ ذبح کرلو" ...... ارشد نے یہ کہہ کر باقی نیلوں کی طرف دیکھا جو بھاگتے ہوئے دور نکل گئے تھے اور اب رک کر اپنے گمشدہ ساتھی کی طرف دیکھ رہے تھے جو ان کی آنکھوں سے اوجھل دو گز گہرے نالے میں پڑا تڑپ رہا تھا۔ نیلے اوس کے میدان میں کھڑے کھڑے جھاڑیاں بن گئے۔ ارشد کے ساتھی اطمینان سے نالے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ مطمئن تھے کہ نیلا اب بچ کر نہیں جا سکتا کیوں کہ ارشد انہیں بتا چکا تھا کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ اور ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے کے بعد جاندار کتنی ہی حرکت کرے، ایک خاص دائرے سے باہر نہیں نکل پاتا۔

☆☆☆

"تو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تمہاری غزالہ آپا نے تمہیں دھوکہ دیا تھا۔؟"

"نہیں دھوکے اور وفاداری کا سوال نہیں ہے عائشہ۔ بس مجھے بہت ذلت محسوس ہوئی تھی جب انہوں نے میری بات سنجیدگی سے نہیں سنی۔ میں ان کے پاس جاکر بیٹھا تھا یہ سوچ کر کہ وہ سب سے زیادہ مجھے چاہتی ہیں۔ لیکن انہوں نے احساس ہی نہیں کیا کہ ان کی اس لاپروائی سے میری کیا حالت ہو گی۔" ارشد یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

"تم کیا سوچنے لگے۔"

کچھ نہیں۔ میں نے دوسرے دن نیلا مارا تھا۔ اس کا تڑپنا یاد آ گیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ بہت دیر تک اپنی دونوں اگلی ٹانگوں سے اپنا دھڑ گھسیٹ گھسیٹ کر بڑھتا رہا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ کھسکتا تو تھا لیکن ایک دائرے کے اندر۔ اس لئے جتنا وہ گھسٹتا تھا سب رائیگاں جاتا تھا۔ وہ پھر اسی جگہ آن پہنچتا تھا۔"

"ارشد!"

"ہاں"

''نازو کہاں ہے جو تمہیں بہت مانتی ہے۔''

''وہ وہیں ہے۔ عجیب بدھو سی لڑکی لگتی ہے۔''

''شکل کیسی ہے اس کی۔؟'' عائشہ نے مسکرا کر پوچھا

ارشد بھی مسکرایا اور شرارتی انداز میں بولا

''شکل تو بہت پیاری ہے بالکل حور جیسی۔''

''حور تم نے کہیں دیکھی ہے۔؟''

''ہاں ہاں سامنے بیٹھی ہے''

عائشہ سچ مچ شرما گئی۔

''تم اس نازو سے بیاہ کر لو۔ وہ تمہیں بہت چاہتی ہے نا۔''

شادی تو نوکری کے بعد ہو گی۔ پھر پہلے تو بڑے کی شادی ہو گی پھر رضیہ کی پھر دیکھا جائے گا۔ اور تم مجھے نہیں چاہتیں کیا؟''

عائشہ چپ ہو گئی

''بولو عائشہ تم بھی تو چاہتی ہو؟''

عائشہ موٹی موٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی

''ہم تم ایک سال سے مل رہے ہیں۔ تم جانتے ہو میں اس سوال کا جواب کبھی نہیں دیتی۔ تم یہ سوال مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔''

''یہ سوال تو اصلی سوال ہے۔ اور کیا پوچھوں؟'' ارشد جز بز ہو کر بولا۔

''بس تم یہ سوال مجھ سے مت پوچھا کرو۔''

''کیوں عائشہ بتاؤ تو سہی۔'' ارشد نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی

''بس ارشد تم یہ سوال مجھ سے مت پوچھو۔ اور دوسرے کبھی مجھے ہاتھ مت لگانا۔''

تب عائشہ نے دیکھا کہ چوڑی پیشانی، سیاہ بالوں اور موٹی موٹی چمکتی آنکھوں والا وہ نوجوان بالکل بچوں کی طرح پریشان ہو گیا۔

''تم... تم عائشہ ایک دفعہ اور یہ بات کہہ چکی ہو۔ یہ کیا راز ہے۔ اے عائشہ بولو۔ بولو عشو۔''

بھولے بھالے چہرے والی وہ لڑکی جو بہت اپنی اپنی سی لگتی تھی خاموش بیٹھی رہی۔ ارشد

سوال بنا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ ارشد کی آنکھوں کے سوال کو کتنی دیر تک برداشت کرتی۔ ہولے سے مسکرائی اور بولی۔

"تم بہت چالاک ہو ارشد۔ مجھے عشو کہہ کر پکار رہے ہو تاکہ میں اپنائیت میں آکر تمہیں سب بتادوں۔ میں نہیں بولوں گی ارشد - میں تمہیں دھوکا نہیں دینا چاہتی۔"

ارشد کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور چلا گیا۔

"کیسا دھوکا عشو - پہیلیاں مت بجھایا کرو۔ جب ارمل گئی تو اس نے دھوکا دیا تھا۔؟ غزالہ آپا نے کیا مجھے فریب دیا تھا۔؟ میں کیا کوئی بچہ ہوں۔ اور تم معلوم نہیں کون سی بازی سجائے بیٹھی ہو۔ مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتیں۔" اس کی آنکھوں میں جھنجھلاہٹ اور بے بسی چمکنے لگی۔

ہوٹل کے کیبن کے پردے کی طرف دیکھتے ہوئے عائشہ نے اس سے کہا

"ارشد تم کیسے ہو۔ اتنے اچھے طالب علم ہو۔ کھیل میں تم آگے ہو۔ تقریروں میں تم سب سے زیادہ انعامات لیتے ہو۔ سارے ساتھی تمہیں کتنا مانتے ہیں۔ بس میرے سامنے آکر تم بچے بن جاتے ہو۔ کمزور بن جاتے ہو۔ مجھے کمزور کردیتے ہو۔ تم ایسے بچگانے انداز سے پوچھتے ہوئے کہ میں تمہیں چاہتی ہوں یا نہیں۔ عجیب آدمی ہو۔ کیا دشمن ہوں تمہاری۔ تم سے تقریباً روز اکیلے میں ملتی ہوں۔ کیا میں تمہیں دوست نہیں لگتی۔ بولو۔؟"

ارشد نے آنکھیں پھیلا پھیلا کر اس کی طرف دیکھا اور دیر کے بعد بولا۔

"ہاں میں تمہارے سامنے آکر چھوٹا سا بن جاتا ہوں۔ مجھے بڑا بن کر منا لیا کرو۔ میں تمہیں چاہتا ہوں نا اس لئے مجھے تمہاری الجھی الجھی باتوں سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ تم خود کو میرا دوست مت کہا کرو۔ دوست تو بہت ہوتے ہیں۔ میرے رشتے کو یہ نام مت دیا کرو۔ اسے ایسے ہی بے نام رہنے دیا کرو۔ کبھی کبھی مجھے اپنے گھر بھی بلا لیا کرو۔"

عائشہ اس کی بے ربط باتوں سے خوش ہوئی۔ اس کا چہرہ چمکنے لگا۔ اس نے ارشد کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ارشد کو بہت اچھا لگا۔ آج ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ عائشہ نے اسے چھوا ہو۔ ورنہ وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ساتھ بیٹھتی کہ مجھے چھونا مت ارشد اور ارشد مان جایا کرتا تھا۔ عائشہ کی کانپتی ہوئی انگلیاں اس کے ہاتھ کی پشت پر رکھی ہیں۔ عائشہ کی ہتھیلیوں سے اس کے بدن میں

ایک ایسا ارتعاش منتقل ہو رہا تھا جو آج سے پہلے اس نے کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔ غزالہ آپا کے بدن سے بھی نہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ عشوؔ کا بدن بہت پراسرار ہے۔ اسے ابھی ابھی احساس ہوا کہ جس لڑکی سے وہ ایک سال سے مل رہا ہے اسے اس نے ابھی ابھی جانا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ عائشہ کی آنکھوں میں، ہونٹوں میں، گردن میں اور ہاتھوں میں ہر جگہ اتنی گنجائش ہے کہ وہ وہاں اپنا چہرہ رکھ سکتا ہے۔ اسے ہوٹل کا یہ جانا پہچانا کیبن اجنبی سا محسوس ہوا۔ اسے ایسا لگا جیسے ہر چیز معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ صرف عائشہ کا وجود ہر طرف چھایا ہوا ہے۔ اسے عائشہ کے بدن سے کچھ ایسے نغمے پھوٹتے ہوئے محسوس ہوئے جسے صرف وہی سن سکتا تھا۔ اس نے کان لگا کے سنا کیا واقعی کچھ نغمے سنائی دے رہے ہیں۔ وہ بے وقوفوں کی طرح مسکرا پڑا۔

اور اسے ابھی ابھی محسوس ہوا کہ وہ عجیب سا رنگ ہر طرف چھایا ہوا ہے جو اسے بے چین رکھتا ہے۔ یہ کون سا رنگ ہے۔ یہ کیسی کیفیت ہے۔ میرے ہاتھ پر رکھا یہ دھیمے دھیمے کانپتا ہوا ذرا ذرا سا سخت سا سبک ہاتھ ...... میرے کتنے نزدیک ہے اور مجھ سے کتنی دور ہے۔

عائشہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر سوچا کہ میں زندگی بھر یہ ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھے رہوں اور بوجھل بوجھل باتیں کرنے والا یہ لڑکا، یہ میرا اپنا سا ایک وجود جو سامنے بیٹھا ہے یونہی ہمیشہ خاموش بیٹھا مجھے دیکھتا رہے تو دنیا کے نظام میں کون سا فرق آ جائے گا۔

عائشہ کو لگا جیسے وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے اس کے ہاتھوں کو تھامنا چاہتا ہے۔

عائشہ کو اپنی نسوں میں ایک عجیب سا تشنج محسوس ہوا۔ اسے لگا جیسے اس کے سینے میں دو دھاری تلوار چل رہی ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ ارشد کے ہاتھ لگتے ہی میرے بدن کی جلد گوشت سے اتر جائے گی اور میں ننگی ہو جاؤں گی۔

"ارشد۔" وہ بہت مشکل سے بول پائی۔

ارشد نے اس کی طرف آنکھیں اٹھا دیں۔

مجھے چھونا مت۔ تمہیں میری جان کی قسم ہے۔ تمہیں اللہ میاں کی قسم۔"

ارشد نے بہت بے بس نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور چپ ہو رہا۔ عائشہ نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر سے اٹھایا۔

ارشد کو لگا جیسے وہ رنگ ایک دم سے غائب ہو گیا۔

"عشوؔ۔ عشوؔ۔!"

"کیا بات ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ایک رنگ ہے جو ہر طرف چھا گیا تھا۔"

"کہاں چھا گیا تھا۔ کیسا رنگ ہے۔؟" وہ حیرت سے بولی

ایک رنگ ہے۔ جو کبھی یہاں نظر آتا ہے کبھی دور نظر آتا ہے۔ کبھی جلدی سے غائب ہو جاتا ہے کبھی بہت دیر تک چھایا رہتا ہے۔ اسے پہچان نہیں پاتا۔ جانے کون سا رنگ ہے وہ۔"

"تم میری چاہت میں پاگل ہو گئے ہو۔ ایسی باتیں مت کیا کرو ارشد۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"نہیں عائشہ میں پاگل واگل کچھ نہیں ہوا ہوں۔ ایک رنگ ہے۔ کبھی دھندلا ہو جاتا ہے۔ کبھی چمکنے لگتا ہے۔ کبھی بہت دیر تک نظر آتا ہے کبھی ایکدم سے غائب ہو جاتا ہے۔ ابھی جب تم نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھا تھا تو وہ رنگ ہر طرف چھا گیا تھا۔ سچ۔"

"تم رومانی باتیں کر رہے ہوں۔ ناولیں بہت پڑھ رہے ہوں کہ فلم زیادہ دیکھ رہے ہو؟"

"تم اسے مذاق مت سمجھو۔ یہ بچپن سے مجھے پریشان کر رہا ہے۔ ایک دن اسے پکڑ لوں گا عشو۔ تمہاری جان کی قسم ایک دن اسے پکڑ لوں گا۔"

عائشہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

"عائشہ تم مجھے اپنا بدن چھونے سے کیوں منع کرتی ہو۔"

"بس یہ مت پوچھنا۔"

"پھر کیا پوچھوں تم سے۔"

وہ مسکرائی۔ پھر دیر تک چپ رہی۔ پھر بہت سنجیدگی سے بولی۔

"ہزاروں باتیں مجھ سے پوچھ سکتے ہو۔ پوچھو کہ ہم لوگ غریب ہیں یا ہماری خواہشات بہت بڑھ گئی ہیں۔ پوچھو کہ دنیا ایسی خود غرض ہو گئی ہے یا ہمارے ہی پاس وقت نہیں ہے کہ ہم دنیا کے معاملات سمجھ سکیں۔ پوچھو کہ جو سرمایہ مریخ پر جانے کے لئے صرف ہو رہا ہے اسے زمین پر زلزلوں اور سیلابوں اور وبائی بیماریوں کی روک تھام میں کیوں نہیں خرچ کیا جاتا۔ پوچھو کہ ایٹمی ہتھیار بنانے کا فائدہ کیا ہے جب دوسری طاقت بھی اتنے ہی مہلک ہتھیار بنانے پر قادر ہے۔ پوچھو کہ پھیلے ہوئے وسیع سمندروں کی دولت غریب ملکوں کو کیوں نہیں ملتی۔ سمندر تو سب کی ملکیت ہیں نا؟ پوچھو کہ ہمارے قائد انتخابات جیتنے کے بعد خود غرض ہو جاتے ہیں یا وہ ایک ایسے نظام میں جی رہے ہیں جہاں عوام کی تکلیف کا احساس ہی ان تک منتقل نہیں ہو پاتا۔

پوچھو کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلنے والے سادہ دل اور محنتی نوجوان جب افسر بنتے ہیں تو کیوں آرام طلب اور بے رحم ہو جاتے ہیں۔ کیوں چاروں طرف سے خواہشات کے شکنجے میں گرفتار کر لئے جاتے ہیں۔ پوچھو کہ عربوں کی عیاشیاں بڑھ گئی ہیں یا فلسطین کا کاز ہی بے دم ہے۔ پوچھو کہ جب دنیا میں مردوں کی تعداد زیادہ ہے تو لڑکیوں کو بر کیوں نہیں ملتے۔ پوچھو کہ علم کی قدر گھٹ گئی ہے یا مادی وسائل کا سوال بڑھ گیا ہے۔ ارشد مجھ سے پوچھو کہ اپنے بندوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو خدائے قادر کیوں نہیں پوری کرتا۔ مجھ سے یہ والے سوال پوچھو پھر دیکھو میں تمہیں کتنے تفصیلی جواب دوں گی۔"

ارشد نے اس کی طرف حیران حیران آنکھوں سے دیکھا۔

"اے عائشہ۔ مجھے ایسی بڑی بڑی باتیں تمہارے منہ سے سن کر ڈر لگتا ہے۔ اب تم فلم کی ہیروین کی طرح لمبی تقریر کرنے کے بعد میرے ہاتھ میں بندوق تھما کر کہو گی کہ جاؤ لام پر۔"

عائشہ ہنس پڑی۔

"عائشہ! تم مجھے اپنے جسم کو چھونے کیوں نہیں دیتیں۔"

عائشہ کو اس سوال پر پیار تو بہت آیا مگر وہ جھلا گئی۔

"تم بہت ضدی ہو ارشد۔ اچھا تم مسلمان ہو؟"

"ہاں"

"مسلمان تو نامحرم کو دیکھتے ہی نہیں ہیں پھر بھلا چھونے کا کیا سوال۔"

ارشد گڑبڑا گیا۔ پھر وہ ایکدم سنبھل کر بولا۔

"تم میری نامحرم تھوڑی ہی ہو۔ میری خاص محرم ہو۔ سمجھیں کہ نہیں۔ پھر تم نے بھی تو مجھے ابھی چھوا تھا۔ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔"

عائشہ بولی۔

"تمہیں قسم ہے مجھے چھونا مت۔ میں تمہیں پھر چھوؤنگی۔ یہ لو۔"

اس نے ارشد کے ہاتھوں کو چھوا۔ اس کے کان کو چھوا اور اس کے ہاتھوں کو زور سے پکڑ لیا۔

ارشد ہنسنے لگا مگر پھر ایکدم چپ ہو گیا۔

عائشہ اسے چپ دیکھ کر خاموش ہو گئی پھر دھیرے سے بولی "میرے گھر آنا اتوار کو۔

امی سے ملواؤں گی۔ اب چلیں بہت دیر ہو گئی ہے۔ اٹھو۔"

اتوار کی صبح اس نے عائشہ کے گھر پر سائیکل روکی۔

دروازے پر پردہ پڑا تھا۔ اس نے پردے میں ہاتھ ڈال کر کنڈی کھٹکھٹائی۔ عائشہ نے دروازہ کھولا۔

"کہاں ہیں امی" اس نے چپکے سے پوچھا۔

"اتنا ڈر کیوں رہے ہوں۔ امی کو معلوم ہے آج آپ آنے والے ہیں باہر گھنٹی بھی لگی ہوئی ہے لیکن آپ پر تو گھبراہٹ کا دورہ پڑا ہوا ہے۔"

وہ گھبرا کر باہر گھنٹی دیکھنے نکل آیا۔

"اور یہ بھی گھبراہٹ کی نشانی ہے۔ جاتے وقت بھی دیکھ سکتے تھے۔"

"تم گھر بلا کر بہت ذلیل کر رہی ہو۔" اس نے عائشہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ عائشہ کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔

اس نے آنگن میں کھلے پھولوں کو دیکھا۔ نومبر کی صبحیں کیسی شفاف ہوتی ہیں۔

تم رات کو روئی تھیں کیا عائشہ؟ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دالان کی طرف دیکھا جس کے اندر کمرے میں عائشہ کی امی کی موجودگی کا امکان تھا۔

"کیوں عائشہ۔ تمہاری آنکھیں کاہے سرخ ہو رہی ہیں۔"

تم اندر آؤ ارشد" اندر سے ایک تھکی تھکی سی نسوانی آواز سنائی دی۔

"تم جاؤ ارشد میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"جلدی سے آجانا" وہ یہ کہتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

سفید لباس میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر کی عائشہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔

"ارے آپ تو بالکل عائشہ جیسی ہیں۔"

"سگی ماں ہوں نا! بیٹھ جاؤ......" ایک کمزور سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر تیر گئی۔

وہ بیٹھ گیا۔

"تم عائشہ کو بہت چاہتے ہو؟"

وہ گڑبڑا گیا۔

"وہ تمہیں بہت چاہتی ہے۔ کوئی لڑکی اس کی دوست نہیں ہے۔ میں ہی اس کی دوست

ہوں۔ میں ہی ماں ہوں اور میں ہی اس کی باپ بھی۔ وہ تم سے کبھی نہیں بتائے گی کہ وہ تمہیں چاہتی ہے۔ اس کی وجہ معلوم ہے؟"

ارشد کو کمرے کی فضا سائیں سائیں کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے عائشہ کی ماں بہت پراسرار محسوس ہوئیں۔

"میری طرف ایسے شک کے ساتھ مت دیکھو۔ حالات کا جبر ایسا ہی قاہر ہوتا ہے۔"

وہ سنبھل کر بیٹھ گیا اور دعا مانگنے لگا کہ عائشہ جلدی سے آجائے۔

اس نے مجھے تمہارے متعلق بہت تفصیل سے بتایا ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ وہ جب چلی جائے تو تم اسے دھوکے باز کے نام سے یاد کرو۔"

"کہاں چلی جائے۔ کہاں جا رہی ہے عائشہ؟"

"جنوری میں اس کی شادی ہو رہی ہے۔ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔"

"میں وہ دوپٹہ تمہیں کہاں سے لا کر دوں۔ پھر یہ کہ وہ تو دوسرے کا ہے ارشد بیٹے۔" ندی کنارے بوڑھے نانا نے کہا تھا۔

اس نے اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ اور سلاخیں پکڑ کر دور دور تک پھیلی ہوئی اس دنیا کو دیکھا۔ اور ان سارے رنگوں کو دیکھا جو کھڑکی کے باہر کھڑکی سے لے کر ریلوے لائن تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور جب ریلوے لائن پر گزرتی ہوئی مال گاڑی اتنی دور نکل گئی کہ آخری ڈبہ نقطہ بن گیا تو اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آنسو روکنے کی اپنی پرانی کوشش کی اور کوشش میں کامیاب ہوا اور کھڑکی بند کر کے واپس پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"ہم لوگ نجیب الطرفین سید ہیں۔ عائشہ کے والد زمینداری کے خاتمے کے بعد گاؤں سے آ کر اس شہر میں بس گئے تھے۔ چھ سات برس تک عدالتی کاموں کی مصروفیت رہی پھر عائشہ پیدا ہوئی۔ اس کی پیدائش کے دوسرے سال انہیں دل کا دورہ لے گیا۔ مرتے وقت انہوں نے اپنے پڑوسی فیاض احمد خان وکیل سے وصیت کی کہ وہ عائشہ کی شادی تک میری کفالت کریں۔ مرحوم نے ڈاک خانے میں اچھا خاصا ورثہ چھوڑا تھا۔ جسے ان کے دوست نے خرد برد کر کے ہم لوگوں کو پالنے کا بہانہ ڈھونڈا۔ پچھلے سال جب ان کا لڑکا سعودی عرب ملازمت کرنے گیا تو اپنی دستگیری کے عوض میں انہوں نے میری لڑکی کا ہاتھ مانگا۔ عائشہ یہاں تھی ہی نہیں۔ وہ کالج کے ٹور پر گئی ہوئی تھی۔ کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ کہیں سے کوئی پیغام بھی

نہیں تھا۔ یوں بھی کھاتے کماتے سید لڑکے عنقا ہیں۔ فیاض خاں وکیل تو میرے کفو میں بھی نہیں ہیں لیکن میں نے رشتہ منظور کر لیا۔ عائشہ جب آئی تو اس نے بڑے صبر کے ساتھ اپنا انجام سنا۔ اس نے ایسی منگنی سنی ہی نہیں تھی جس میں لڑکی موجود ہی نہ ہو لیکن وہ میری بات کے آگے مجبور تھی۔"

کہتے کہتے وہ رکیں، ارشد کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر کہنا شروع کیا۔

اس کے چند ہی روز بعد تم نے کالج کے جلسے میں اس کے منہ سے غزل سنی اور اس سے ملے۔ یہ سب اس نے مجھے خود بتایا ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کیا منگنی ختم نہیں ہو سکتی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں اس کے مرے باپ کی عزت کا سودا نہیں کر سکتی۔ لڑکا ہونہار ہے۔ خوب کماتا ہے۔ دیکھنے میں بھی اچھا لگتا ہے۔ کیا کہہ کر منگنی توڑوں گی۔ پھر مرے باپ کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے ارشد بیٹے۔"

"تو آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟" اس نے دھیمے سے پوچھا۔

"میں نے نہیں بلایا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آپ ارشد کو تفصیل سے بتا دیں۔ اس لئے میں نے تمہیں سب باتیں بتا دیں۔"

"کیا کوئی صورت ایسی نہیں ہے کہ آپ عائشہ کا بیاہ میرے ساتھ کر دیں۔" اس نے ایکدم سے کہہ دیا۔

وہ اس کی طرف بہت شفقت سے دیکھتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں موتی سے چمکنے لگے۔ وہ اٹھیں اور اٹھ کر انہوں نے ارشد کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

ارشد نے ان کا ہاتھ پکڑ کر مضبوطی سے پوچھا۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بہت دھیرے سے لیکن مضبوط لہجے میں بولیں۔

"نہیں۔ اور آئندہ مجھے تم دونوں میں سے کوئی بھی اس کشمکش میں نہ ڈالے۔ عائشہ چائے لے آؤ۔"

ارشد کے ہاتھ سے ان کا ہاتھ چھوٹ گیا اور آنکھوں کے سامنے مختلف رنگوں کے مختلف زاویوں کے خاکے بننے بگڑنے لگے۔

"میں بہت جلد ملازمت حاصل کر لوں گا۔" اس نے آخری ہتھیار استعمال کیا۔

نہیں بیٹے اس سلسلے میں ہم سب مجبور ہیں۔ مجھے اتنی سی دیر میں تم سے بہت محبت محسوس ہونے لگی ہے۔ لیکن یہ میرے مرحوم شوہر کی عزت اور ان کی بیوہ کی بات کا سوال ہے۔ میں تمہیں واضح طور سے انکار کر رہی ہوں تاکہ تم اب یکسو ہو جاؤ۔"

بندوق کی گولی نے نیلے کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی تھی۔ اگلی دونوں ٹانگوں سے وہ گھسٹ گھسٹ کر دائرے کی شکل میں آگے بڑھ رہا تھا اور اسی جگہ پہنچ جاتا تھا جہاں سے چلتا تھا۔

عائشہ نے اس کی طرف چائے سرکائی۔ اس نے بہت شوق کے ساتھ چائے پی۔

چلتے وقت عائشہ کی ماں نے کہا۔

"ارشد بیٹے اب تم عائشہ سے مت ملا کرنا۔"

وہ جاتے جاتے مڑا اور بہت بے بسی سے عائشہ کی طرف دیکھا۔

"امی ارشد بہت رویا کرے گا۔ یہ مجھے بہت چاہتا ہے امی۔"

"نہیں۔ میں رویا نہیں کروں گا عائشہ کی امی" اس نے تقریباً روہانسی آواز میں کہا۔

"اب تم امی کے سامنے مت رو پڑنا پاگل" عائشہ نے بہت بے بسی کے ساتھ اسے ڈانٹا۔

" تم مجھے اتنا کمزور کیوں سمجھتی ہو۔" پٹ سے اس کی آنکھ سے ایک آنسو گرا۔

"امی۔ یہ رو رہا ہے۔ اسے میں بہت چاہتی ہوں۔ اسے رونے مت دیجئے امی۔ اسے چپ کر لیجئے۔"

عائشہ کی ماں نے اس کے آنسو پونچھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

ارشد نے ہولے سے ان کا ہاتھ بیچ میں ہی اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

" یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں کیا کروں گا۔ اس میں مجھے آپ کی مدد ملی تو میری عادت بگڑ جائے گی۔ تم عائشہ پرسوں کون سی غزل گاؤ گی؟"

وہ حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگی۔

"ماحول کو نارمل بنانے کے لئے یہ سوال پوچھ رہا ہوں۔" اس نے دھیمے سے مسکرا کر کہا۔ کوئی کام ہوا کرے تو مجھے بلا لیا کریں۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔" اس نے عائشہ کی امی کو مخاطب کر کے کہا۔

ہاسٹل کے کمرے میں آکر اس نے اپنے بکس کو چھان مارا۔ کونا کونا چھان لیا لیکن شیشے کا ٹکڑا نہیں ملا۔ بچپن سے جمع کی ہوئی تمام چیزیں اس نے نکال کر رکھیں۔ چاندی کی چھوٹی کھوکھلی

گیندیں، سفید موتی، سنہرا پین۔ باہر آ کر انہیں اینٹوں سے کچل کر سرمہ بنا دیا۔ ارشد نے سوچا میں کیوں سب چیزوں سے وابستہ رہتا تھا۔ میں کیوں اپنے بچپن کو گلے سے لگائے رکھتا ہوں۔ میں کیوں سب سے پیار کرنے لگتا ہوں۔ اچانک اسے یاد آیا کہ ان چیزوں میں وہ شیشے کا ٹکڑا نہیں تھا جس میں ست رنگی شعاعیں پھوٹتی تھیں۔ رات کو وہ اسے اپنے سامان میں تلاش کرتا رہا۔ جب صبح کی اذان ہونے لگی تو وہ جوتوں سمیت بستر پر گر پڑا۔

سوتے وقت اس نے بہت واضح انداز میں محسوس کیا تھا کہ اس کی آنکھیں بالکل خشک ہیں۔ آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔

☆☆☆

دوسرے دن وہ بڑے کو بتائے بغیر گھر چلا گیا۔ امی ابا اسے اچانک دیکھ کر گھبرا گئے۔

"کچھ نہیں۔ بس دل چاہ رہا تھا سب کو دیکھنے کو۔ رضیہ کہاں ہے؟

"پڑھنے گئی ہے۔ آتی ہی ہوگی۔ کیوں؟"

"کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی اسے دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔"

تھوڑی دیر میں رضیہ آ گئی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی جان کو دیکھ کر کھل اٹھی۔ وہ دونوں آنگن میں بیٹھے بہت دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اسے ابھی ابھی محسوس ہوا کہ اب رضیہ بڑی ہو گئی ہے۔ وہ مسلسل نگاہیں نیچے کئے اس سے باتیں کر رہی تھی۔

"رضیہ"

"جی"

"تم...... تم کسی لڑکے سے کبھی شادی وادی کی بات مت کرنا۔ اچھا!"

"بھائی جان۔ کیا میں کوئی بے شرم لڑکی ہوں۔" اس نے سرخ ہو کر کہا۔

نہیں بے شرمی کی بات نہیں۔ جلدی میں ایسی بات منہ سے نکل جاتی ہے۔"

لیکن عائشہ نے تو جلدی میں بھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔

میں بھائی جان... کسی سے بات ہی نہیں کرتی۔ سیدھی کالج سے گھر آ جاتی ہوں"

"شاباش" اس نے اپنی بہن کی طرف بہت چاہت کی نظروں سے دیکھا۔

اماں آنگن میں دھوبی کے لائے ہوئے کپڑے ملا رہی تھیں۔

اس نے اماں کو ہولے سے مخاطب کر کے کہا کہ بابا نہ سن لیں۔

"اماں۔ آپ اس لڑکی کے ہاتھ جلدی سے پیلے کر دیجئے"

اماں نے اپنے اکھڑ، ضدی اور خود سر بیٹے کو ہنستے بولتے دیکھا اور خوش ہوئیں۔

"تھوڑی سی ہلدی مل لوں تو پیلے ہو جائیں گے۔" رضیہ نے شرارتاً کہا۔

"یہ محاورے بہت نامعقول ہوتے ہیں۔ میرا مطلب ہے جلدی سے تمہاری ڈولی اٹھوانے کا انتظام کرنا ہے۔"

"بھائی جان" اس نے سرگوشیوں کے انداز میں کہا۔ اب تو کار میں آتی ہے بارات"

"بڑی تیز ہو گئی ہے تو۔"

ارشد اٹھ کر اماں کے پاس گیا۔ اماں ایک سفید کپڑے کو ہاتھوں میں لئے بیٹھی تھیں۔ کپڑا بہت صاف ستھرا دھلا تھا۔ اس نے اماں کے چہرے کو دیکھا۔ اماں اور ابا کے چہرے بھی اب کتنے سفید لگنے لگے ہیں۔ دھلے دھلے صاف ستھرے۔

"رضیہ یہ دوپٹہ اب مت پہننا۔ یہ ختم ہونے والا ہے۔ دیکھو کیسا صاف ہو کر آیا ہے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"جب کپڑا ختم ہونے والا ہوتا ہے تو بہت صاف ستھرا دھل کر آتا ہے۔ وہ اس کی آخری دھلائی ہوتی ہے۔ بالکل ہلکا پڑ جاتا ہے۔"

تب اماں کے سفید چہرے کو دیکھ کر وہ اندر ہی اندر کانپ گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پھر اماں کے چہرے کو دیکھا

"اماں" رضیہ قریب آ کر شرارت سے بولی۔

"آپ بڑے بھائی اور ارشد بھائی جان کی دلہنیں لے آئیے۔ ہم دونوں بیٹھ کر حکم چلائیں گے اور وہ دونوں کھانا پکائیں گی۔"

دلہن کے نام پر ارشد کی آنکھوں کے سامنے وہ پرانا رنگ پھر گزرا۔ یہ رنگ مجھے کیوں اتنا پریشان کرتے ہیں اماں۔ تمہارا سفید چہرہ، ابا کا سفید سر، بادلوں کا مٹیالا رنگ، دیواروں کا کائی زدہ رنگ، شام کا دھندلا رنگ، رات کے آسمان کا سیاہ رنگ...... یہ سب مجھے کیوں ڈراتے ہیں۔

اماں جب میں پڑھنے نہیں گیا تھا، یہیں پڑھتا تھا تب بھی رنگ مجھے بے چین کرتے تھے لیکن تب جستجو رہتی تھی کہ رنگوں کے پیچھے کیا ہوتا ہے۔ آسمان کے نیلے رنگ کے پیچھے کون ہے، کھیتوں میں ہرا رنگ کون بھرتا ہے، سرسوں کے پھول پیلے رنگ کے کیوں ہو جاتے ہیں۔

گیہوں کا خوشہ دیکھتے دیکھتے سنہرا کیسے ہو جاتا ہے، جاڑوں کے پرندے پیلے، سرخ، ہرے، کاسنی رنگ کہاں سے چرا لاتے ہیں۔ زمین پانی پی کر سانولی کیوں ہو جاتی ہے۔ سورج ڈوبتے وقت سرخ کیوں ہو جاتا ہے اور بادلوں میں اتنے عجیب عجیب رنگ کہاں سے آجاتے ہیں۔ ہیں اماں۔

اس کا دل بے ساختہ چاہا کہ اماں سے پوچھے لیکن وہ چپ رہا کہ کہیں رضیہ اسے پاگل نہ سمجھ لے۔

جب رضیہ ہٹ گئی تو اس نے اماں کی گود میں سر رکھ کر کہا۔

"اماں۔ تم سے ایک بات پوچھوں۔"

"پوچھو۔ لیکن یہ مت پوچھنا کہ سب سے زیادہ کسے چاہتی ہوں۔"

اسے اماں کی اس بات سے صدمہ ہوا۔ وہ جان بوجھ کر اس وقت یہ سوال نہیں پوچھنا چاہا تھا حالانکہ یہ سوال کتنا اہم ہے۔ پر اماں کو میرے دل کا پتہ ہی نہیں چل پاتا۔ عجیب اماں ہیں۔ اس نے اماں کے سفید چہرے کو دیکھا تو اسے اماں پر پیار آگیا اس نے اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر پوچھا۔

"اماں۔ وہ بات نہیں ایک اور بات ہے۔ یہ بتاؤ مجھے ایک عجیب سا رنگ نظر آتا ہے کبھی تو فوراً غائب ہو جاتا ہے اور کبھی بہت دیر تک سامنے رہتا ہے۔ لیکن اس کی شناخت نہیں کر پاتا۔ بس دل چاہتا ہے کہ بغیر اس رنگ کو پہچانے اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا چلا جاؤں اور اسے پکڑ لاؤں۔"

"رنگ کو تم کیسے پکڑ سکتے ہو؟" اماں نے ارشد کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔

"بس یہی تو میں سوچتا رہ جاتا ہوں اماں۔ لیکن وہ کون سا رنگ ہوتا ہے اماں میں سمجھ نہیں پاتا۔"

"ایک بار" اماں نے ماضی میں جھانک کر کہا "ایک بار ہمارے ابا بھی کہہ رہے تھے کہ چھوٹے کو ایک رنگ بہت پسند ہے۔"

"کون سا رنگ اماں؟" ارشد اٹھ بیٹھا۔

"اب یہ تو یاد نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ تم بہت روتے تھے تو انہوں نے تمہیں دلاسہ دے دیا تھا کہ کوئی گھوڑے پر بیٹھ کر آئے گا اور وہ رنگ تمہیں دے جائے گا۔"

"پھر اماں۔ پھر کیا میں بہل گیا تھا؟"

معلوم نہیں۔ لیکن تم آسانی سے بہلتے کہاں ہو۔"

"اب بہل جاتا ہوں اماں۔" ارشد نے اماں کی گود میں سر رکھ دیا۔

"یہ میرا چھوٹا بیٹا خدا جانے کیسا ہے۔

"اماں وہ رنگ کون سا رنگ تھا؟"

"یہ اب یاد نہیں ارشد۔"

اماں کی گود میں حرارت تھی اور نرمی تھی۔ اور آنکھوں کو بہت سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک اسے عائشہ یاد آئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ آسمان پر پھر وہی رنگ اڑ رہا تھا۔ اس رنگ کے محیط پر سنہرے روپہلے رنگ جھماکے مارتے تھے اور اندر بہت سے ہلکے گہرے رنگ ایک دوسرے میں جذب ہو کر کبھی الگ ہو جاتے کبھی مل جاتے۔

"وہ ہے اماں۔ دیکھو وہ" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور انگلی سے اسمان کی طرف اشارہ کیا۔ وہ رنگ آہستہ آہستہ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور ہوتا جا رہا تھا۔

"کدھر ہے۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ آسمان میں کوئی رنگ تھوڑے ہی اڑا کرتے ہیں۔"

اماں! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میں نے آنکھیں بند کی تھیں تو عائشہ ویسا ہی دوپٹہ پہنے تھی۔ آنکھیں کھولیں تو وہ دوپٹہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ اڑتا ہوا دور، بہت دور کہیں جا کر کھو گیا تھا۔"

"عائشہ کون ہے" اماں نے اس کی آنکھوں میں دیکھے بغیر کہا۔

"ایک لڑکی ہے۔ ساتھ میں پڑھتی ہے۔ پر اماں اس کی تو منگنی ہو گئی ہے۔ ہماری اس سے کوئی بات نہیں ہے۔ خدا کی قسم اماں اس سے میری شادی نہیں ہو گی۔"

اماں کچھ سمجھیں کچھ نہیں سمجھیں۔ وہ چپ چاپ اپنے بیٹے کی آنکھوں پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہیں۔ جوان بیٹے کی آنکھوں میں نمی ان سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

☆☆☆
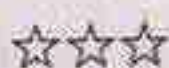
کلاس سے نکل کر اس نے آسمان کو دیکھا۔ یہ شروع دسمبر کا آسمان تھا اور یہ سردیوں کی شام تھی۔ سردیوں کی شامیں کتنی اداس ہوتی ہیں۔ سڑک پر بہت کم لوگ تھے اور اسے اپنا وجود بہت بے معنی اور تنہا محسوس ہو رہا تھا۔

سامنے اشوک کے درخت کے نیچے وہ کھڑی ہے۔

ہم دونوں کو اب ایک دوسرے سے نہیں ملنا ہے۔ میں اس کے بغیر تین دن زندہ رہ چکا ہوں۔ اس کی ماں ہم دونوں کو منع کر چکی ہیں۔ میں اس سے نہیں ملوں گا۔ قریب سے گزروں گا تو آہستہ سے نکل جاؤں گا۔ سلام بھی نہیں کروں گا۔ اس کی طرف نظر بھر کے دیکھوں گا بھی نہیں۔

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھا تھا۔ کپکپاتی ہوئی حرارت میرے ہاتھ میں داخل ہوئی تھی۔ میں نے اس کے وجود سے بہت مترنم نغمے پھوٹتے ہوئے سنے تھے۔ اس کے ہاتھ کے لمس میں کتنی چاہت تھی۔

شاید وہ میری طرف دیکھ رہی ہے۔ شاید وہ میرے ہی انتظار میں کھڑی ہے۔

ہم لوگ اب بچے نہیں ہیں۔ ہم پر ہماری پوری ذمہ داریاں ہیں۔ ہم معیار سے گرا ہوا کوئی کام نہیں کریں گے۔ یہ بات اسی دن طے ہو گئی تھی کہ اب ہم نہیں ملیں گے۔

جب وہ مجھے ارشد کہہ کر پکارتی تھی تو اس کی آواز میں کتنی محبت ہوتی تھی۔

میں اس کے قریب آتا جا رہا ہوں۔ وہ بالکل ساکت کھڑی ہے۔ کیا وہ بت بن گئی ہے۔ اس کے بعد میں کتنا اکیلا ہو جاؤں گا۔ چار مہینے بعد وہ چلے جائے گی۔ کیا ان چار مہینوں میں ہم ایک دوسرے سے بات چیت بھی نہیں کر سکتے۔

اس نے اگر مجھے پکار لیا تو میں کیا کروں گا۔

اگر میں اس سے بالکل بات نہیں کروں گا تو یہ کتنی غیر معمولی بات ہو گی۔ اس کے دل کو کتنا دکھ لگے گا۔ پھر وہ گھر جا کر چپکے چپکے روئے گی۔ پھر میں ہوسٹل جا کر اپنے کمرے میں بند ہو جاؤنگا۔ شام کو بیرا کھانا لے کر آئے گا تب بھی دروازہ نہیں کھولوں گا۔

میں اس کے سامنے کھڑا ہوں۔ میرے سامنے درخت کے نیچے چپ چاپ کھڑی یہ لڑکی کتنی اچھی لگتی ہے۔ اس کے روکھے روکھے بال کتنے لمبے ہیں۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں کتنا تیج ہے۔ یہ بالکل چپ کھڑی ہے۔ یہ مجھے مخاطب کیوں نہیں کرتی۔ کوئی اس سے کہہ دے کہ یہ مجھے جلدی سے ارشد کہہ کر مخاطب تو کرے۔ یہ بولے تو۔

سر جھکائے یہ لڑکا میرے ہی بارے میں سوچتا ہوا آ رہا ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ کتنے مضبوط قدموں سے چل رہا ہے۔ یہ مجھے دکھانا چاہ رہا ہے کہ وہ مجھ سے دور رہ کر دیوانہ نہیں ہو گیا۔ لیکن اس کا چہرہ اتنا ویران کیوں ہے۔ یہ کیوں مجھے اتنا چاہتا ہے۔ یہ نازو کے پاس کیوں نہیں چلا جاتا۔ یہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس نے اگر مجھ سے پوچھ لیا کہ

میں یہاں کیوں کھڑی ہوں تو میں کیا جواب دوں گی۔ میں اسے کیسے بتاؤں گی کہ ارشد جب تم غصہ ہوتے ہیں تو مجھے باپ کی طرح لگتے ہو۔ جب ہنستے ہو تو محبوب لگتے ہو اور جب پریشان ہو کر آنکھیں نم کرتے ہو تو بالکل مجھے اپنے بچے جیسے لگتے ہو۔ اس کے قدم یہاں آکر رک کیوں گئے ہیں۔ کیا ہم دونوں اسی طرح زندگی بھر کھڑے رہیں گے۔

"عائشہ" اس نے ہولے سے پکارا۔

اس نے مجھے پکارا ہے۔ میرے ہونٹ کیوں نہیں کھل رہے۔ یہ میری خاموشی سے ناراض نہ ہو جائے۔

عائشہ تم یہاں کیوں کھڑی ہوں۔ "رکشے... کا... انتظار ہے؟" ارشد نے رک رک کر پوچھا۔

"ارشد! تم تین دن تک کہاں تھے"

"میں اپنے گھر گیا تھا امی کے پاس۔" اس نے جواب دیا۔

اس نے اتنے روز مجھے یاد کیا ہو گا۔ ہر روز شام کو کلاس سے نکل کر رکشے کا انتظار کرنے کے بہانے کھڑی ہو کر مجھے تلاش کرتی ہو گی۔

"تم نے کل بھی رکشے کا انتظار کیا تھا۔" اس نے اس کی انکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

اس نے ہولے سے سر ہلایا۔ آنسو کا ایک موٹا سا قطرہ آنکھ سے نکل کر رخساروں پر ہوتا ہوا اس کے دامن پر گرا۔

"عشو" اپنی امی کے پاس لے چلو مجھے۔ جلدی چلو۔"

"عائشہ کی امی...... آپ سے ایک بات کہہ رہا ہوں۔ مجھے عائشہ سے ملنے دیا کیجیے۔ میں گھر پر ملا کروں گا۔ آپ مجھے نہیں ملنے دیں گی تو میری پڑھائی لکھائی سب غارت ہو جائے گی۔ مجھے عائشہ بہت یاد آتی ہے عائشہ کی امی۔ آپ اس کی شادی کسی سے بھی کیجیے لیکن ہم دونوں پر کوئی ایسی پابندی مت لگایئے۔ ورنہ میں پڑھائی لکھائی چھوڑ چھاڑ کر اپنے گھر چلا جاؤں گا۔"

وہ خاموشی سے بیٹھی سنتی رہیں۔ بہت دیر تک خاموش رہیں۔

"جاؤ مل لو۔ لیکن میں کبھی یہ سنوں کہ تم دونوں باہر اکٹھا دیکھے گئے۔"

"میں عائشہ کے کمرے میں جا کر مل لوں اس سے۔" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

اسے عائشہ کی امی بہت خوبصورت، بہت مہربان اور بہت بڑی نظر آئیں۔

"جاؤ" وہ بہت آہستہ سے بولیں۔

پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہوا۔ میز پر اس کی کتابیں رکھی تھیں۔ وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ اس کی گود میں پڑے تھے اور جذبوں کی شدت سے آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے۔

"تم میرے پاس.... پلنگ پر بیٹھ جاؤ ارشد۔"

وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ آج اس کا دل بے ساختہ چاہ رہا تھا کہ وہ عائشہ کے ہاتھ چھوئے۔ انہیں خوب دیر تک تھامے رہے۔ پھر جہاں عائشہ کی گردن پر ہلکی نیلی ایک مہین سی رنگ ہے وہاں ہولے سے اپنے ہونٹ رکھ کر بے آواز پیار کرے۔ یہ کہتی ہے کہ میں اسے ہاتھ بھی نہ لگاؤں اور میرا دل چاہتا ہے کہ اسے چھو کر محسوس کروں۔ غزالہ آپا تم نے میری عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ تم بہت خود غرض تھیں غزالہ آپا۔

میں ایک سانس کے فاصلے پر اس کے قریب بیٹھا ہوں۔ یہ مجھ سے کچھ بولتی کیوں نہیں۔؟

ارشد نے دیکھا عائشہ کے پیروں کے گلابی ناخونوں کے پیچھے کھنچا کھنچا بھرا ابھرا گوشت تھا اور پیروں پر راستے کی دھول کی ایک ہلکی سی تہہ تھی۔ اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اس کے پیروں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے آہستہ سے پیر پیچھے کھسکا لئے۔ پھر بھی ارشد نے ہاتھ نہیں ہٹایا۔ عشو نے شرمندہ شرمندہ نظروں سے ارشد کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا۔

"تم سیدانی ہو اس لئے۔ اُن کی اولاد میں سے ہو نا۔"

وہ اسے ایسے دیکھتی رہی جیسے پھر دوبارہ ان لمحوں کو کبھی نہیں پاسکے گی۔

تب اس نے ارشد کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑے اور ان پر اپنی نمناک آنکھیں رکھ دیں۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ ارشد کے ہاتھ اس کے آنسوؤں سے بھیگ چکے ہوں گے تب اس نے ارشد کے بھیگے بھیگے ہاتھوں پر اپنے سوکھے ہونٹ رکھے۔ پھر اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کا سر اپنی گود میں چھپا لیا۔

اس وقت امی بھی آجائیں تب بھی اس کا سر میں اپنی گود سے نہ ہٹاؤں۔

اس کی گود میں سر چھپا کر ارشد کو سب سے پہلے وہ جگہ ہلکی سی گرم محسوس ہوئی۔ پھر اسے وہ جگہ تھوڑی نم سی محسوس ہوئی۔ پھر اسے اس کی گود میں لباس کے نیچے سے ایک گیلی گیلی خوشبو پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے بغیر آواز پیدا کئے ایک لمبی سانس کھینچی۔ انسانی جلد،

اور لہو کی ایک وحشت انگیز بو کو اس نے اپنے بدن میں جاتے اور وجود میں پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔ اسے لگا اس کا پورا آپا گنگنے پانی میں دھیمے دھیمے شرابور ہو رہا ہے اور سر سے پاؤں تک دھیمے دھیمے کچھ سلگ رہا ہے۔ اپنے چہیتے بدن کے قرب کا یہ اس کا پہلا خود مختار تجربہ تھا جو اسے زمین سے بہت اوپر انجان خلاؤں میں لے گیا۔

آنکھیں بند کئے کئے ارشد کو ایسا لگ رہا تھا جیسے دنیا ایک دم سے بہت اچھی ہو گئی ہے۔ اس نے عائشہ کی گود میں ایک ایسی مانوس گرمی محسوس کی جو آہستہ آہستہ اس کے پورے بدن میں ایک نرم نرم سا نور بھر رہی تھی۔ اس کی بند آنکھوں کے سامنے وہ رنگ آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔

''عشو۔ میں وہ رنگ دیکھ رہا ہوں۔ اب بھی اس کی پہچان نہیں کر سکتا لیکن یہ وہی رنگ ہے۔ کیا تمہیں نظر آ رہا ہے۔؟'' اس نے دھیمے سے پوچھا۔

''نہیں ارشد۔ وہ رنگ مجھے نہیں نظر آ رہا۔ لیکن مجھے تم نظر آ رہے ہو۔ تم میری گود میں سر رکھے ہوئے ہو۔ اور مجھے یہ سوچ کر کیسا عجیب سا لگ رہا ہے کہ یہ خواب نہیں ہے۔ تم سچ مچ میرے پاس بیٹھے ہو۔ تم میرے اچھے بہت اچھے سے ارشد ہو نا!

اس نے آنکھیں اٹھا کر ان آنکھوں کو دیکھا جو بھری ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھے۔

''تم بھی تو آنسو بھر لاتے ہو ارشد'' جیسے وہ اپنے رونے کی توجیہہ کر رہی ہو۔

'' میں.... اصل میں عشو بہت حساس ہوں.... ہو گیا ہوں۔ مجھے کوئی غم والی بات برداشت نہیں ہو پاتی۔ میں کم ہمت ہوں اسی لئے حساس بہت ہوں۔''

''اور ارشد جب میں چلی جاؤں گی تب تم روؤ گے تو تمہیں کون منائے گا۔''

تب ارشد نے محسوس کیا کہ اس کے ماتھے سے کوئی چیز اندر ہی اندر اتری اور پلکوں کے پیچھے آ کر رک گئی۔

''تم ابھی مجھ سے کچھ مت کہو عشو۔ کچھ دیر بالکل چپ رہو عشو۔''

''اچھا نہیں کہوں گی۔'' اس نے ارشد کے بالوں کو برابر کیا۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور مطمئن ہو گئی کہ ان میں نمی نہیں تھی۔ وہ اس کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ایسے عالم میں تھا جہاں روز روز کوئی نہیں پہنچتا۔

عشو! بازار میں انسانی گوشت تو روپئے کلو سے بھی کم قیمت پر مل جاتا ہے۔ مگر کوئی

قیمت یہ لمحے نہیں دے سکتی۔ یہ سکھ کے لمحے جب وقت تھما ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان لمحوں کے پیچھے رفاقت کی کتنی بڑی تاریخ ہوتی ہے۔ ان لمحوں میں جب دو چاہنے والے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوتے ہیں تو ان نگاہوں میں کتنے عجیب عجیب سے راز ہوتے ہیں۔ ان نگاہوں میں کوئی سودا نہیں ہوتا صرف ایک دوسرے کو سب کچھ دے دینے کا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ جذبہ کتنا قیمتی ہوتا ہے۔ یہ جذبہ کتنا کمیاب ہوتا ہے۔ اور سب کچھ دے دینے کا جذبہ رکھنے والا یہ وجود مجھ سے کتنی جلد جدا ہونے والا ہے۔

عشو نے جھک کر ارشد کے ماتھے کو چوما۔ اس کی آنکھوں کو چوما۔ تب ارشد بولا۔

"عشو، تمہیں مجھے پیار کرنے میں جھجھک نہیں ہوتی۔ تم شرماتی نہیں بالکل؟"

"کاہے کو شرماؤں۔ تم میرے غیر تھوڑے ہو۔ میرے ارشد ہو۔"

اور تم میری عشو نہیں ہو کیا۔؟"

"ہاں میں تمہاری عشو ہوں۔ لیکن مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم حد سے بڑھ جاؤ گے اور میں تمہیں روک نہیں پاؤں گی۔ میں چاہوں گی تب بھی نہیں روک پاؤں گی۔"

وہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ عشو۔"

وہ اس کے بالوں کو سنوارتی رہی

"عشو میں تمہیں پیار کروں گا"

وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہی۔ پھر اس نے ارشد کے بالوں کو چوم کر ہولے سے کہا:

"میرا اچھا سا ارشد میرے ماتھے پر پیار کرے گا۔ بس۔"

ارشد نے اٹھ کر عشو کا سر اپنے زانوؤں پر رکھا اور اس کے بالوں سے کھیلتا رہا۔ اس کے اجلے ماتھے کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں کو پڑھتا رہا۔ اس کے چہرے کو تکتا رہا اور پھر آہستہ سے اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ تسکین کے ایک اتھاہ احساس سے عائشہ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ پھر جانے ارشد کے دل میں کیا آیا۔ اس نے عائشہ سے کہا۔

"میں بے ایمانی کر رہا ہوں عشو" اور ڈرتے ڈرتے عشو کے گرم ہونٹوں کو چوم لیا اور جلدی سے عائشہ کی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دئے کہ وہ آنکھیں کھول کر اس کی طرف شکایتی نظروں سے نہ دیکھ سکے۔

جب اس نے بہت دیر کے بعد عائشہ کی آنکھوں سے ہونٹ ہٹائے تو عائشہ نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ دیر تک دیکھا۔

"تم اداس سے کیوں ہو ارشد؟"

"معلوم نہیں کیوں؟ میں سوچنے لگتا ہوں کہ اب اتنی چاہت سے مجھے اور کوئی پیار نہیں کرائے گا۔

"تم ایسی باتیں کرتے ہو تو میرا دل بہت بے چین ہو جاتا ہے ارشد۔ ہونا ہی ہے جو ہو گا پر اس کا دھیان مت دلایا کرو۔ پھر میرا بھی دل ڈوبنے لگتا ہے ارشد۔"

"نہ تم مت رونا عشو۔" ارشد نے اسے چپٹا کر اپنے پاس کر لیا۔ تب عائشہ نے اس کی آنکھوں سے آنسو خشک کیے۔

عائشہ نے آنکھیں خوب کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

یہ آنکھیں کھولے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں کوئی سوال نہیں ہے۔ لیکن سوچ کتنی ہے۔ اسے کس بات کی فکر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اسے کس بات کی فکر ہے لیکن خود کو بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ مجھے چاہنے والی یہ آتما مجھ سے دور ہو جانے کی فکر میں دکھی ہو گئی ہے۔ معلوم نہیں کیوں مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔ اسی لئے میں خود کو فریب دینے کے لئے خود اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ عشو میری طرف ایسے کیوں دیکھ رہی ہے۔

وہ اسے بالکل بے خوف نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس بھولے بھالے چہرے پر ہلکی سی ندامت کا سایہ رہے ورنہ یہ بے خوف ہو کر خود غرض ہو جائے گی۔ مجھے بھول جائیگی۔ ندامت کا یہ بندھن اسے مجھ سے باندھے رہے گا۔

یہ سب سوچ کر اسے خود پر غصہ آیا لیکن اس نے برداشت کیا۔ اس کا بے ساختہ دل چاہا تھا کہ وہ عشو کی آنکھیں بہت دیر تک چومے اور کہے کہ۔۔۔ تم نے ایسا کیا کیا ہے جو تم مجھ سے شرمندہ ہو۔ تم تو مجبور ہو۔ تمہاری امی زبان دے چکی ہیں۔ اسی لئے تم دوسرے سے شادی پر راضی ہو۔ ورنہ میں سب جانتا ہوں کہ تم مجھے کتنی شدت سے چاہتی ہو۔ لیکن اس نے یہ سب نہیں کہا۔ اسے اپنی چالاکی پر حیرت ہوئی۔ پھر اور زیادہ حیرت تب ہوئی جب اس نے محسوس کیا کہ اسے اپنی چالاکی پر خود ہی پیار بھی آرہا ہے۔

جس دن اس کی شادی تھی وہ اس کے دولہا سے ملا۔ ہاتھ ملایا اور مبارک باد دی۔

اور اس دن اس نے بہت مدت کے بعد ایک دعا کی اور دل ہی دل میں ان سے کہا کہ یہاں سے رخصت ہو کر میری عشو آپ کے علاقے میں بسنے کے لئے آ رہی ہے۔ بس اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس کا شوہر ہمیشہ اسے چاہے۔ میری عشو کو کھانے پینے، اوڑھنے پہننے، رہنے سہنے کی کوئی تکلیف نہ ہو۔ آپ خدا سے دعا فرمایئے گا۔

شادی کا پنڈال اکھاڑا جا چکا تھا۔ میزیں آڑھی ترچھی پڑی تھیں۔ کاغذ کی جھنڈیاں ہوا میں ہولے ہولے ہل رہی تھیں۔

تب ارشد نے ہوسٹل کے کمرے میں لیٹے لیٹے اپنی بھیگی آنکھوں سے کہا۔

اب نہ بھیگا کرو۔ اب تمہیں چومنے والے ہونٹ اس وقت بہت دور جا چکے ہیں۔ اور وہ آنکھیں جو تمہیں دیکھ کر مغموم ہو جاتی تھیں اب یہاں نہیں ہیں۔

میری عشو کی آنکھیں... وہ بڑی بڑی شفاف آنکھیں، وہ چاند ستاروں جیسی آنکھیں، وہ سورج جیسی روشن اور بے داغ آنکھیں، وہ ضدی اور سرکش آنکھیں، وہ باغی اور وحشی آنکھیں، وہ بے پروا آنکھیں، وہ مغموم آنکھیں، وہ سمندر جیسی اتھاہ اور آسمان جیسی وسیع آنکھیں، وہ بہادر آنکھیں، وہ سپاہی آنکھیں، وہ سوال آنکھیں، وہ جواب آنکھیں، وہ جاڑوں کی راتوں جیسی سنسان اور گہری آنکھیں، وہ گرمیوں کی دوپہروں جیسی خاموش اور اجاڑ آنکھیں، وہ بادلوں جیسی گھنگھور آنکھیں، وہ تھکی تھکی آنکھیں، وہ وفادار آنکھیں مجھ سے بہت دور جا چکی ہیں۔ ہزاروں کوس دور۔

شادی کے تیسرے دن عائشہ کی ماں نے اسے بلایا۔ شادی میں آئے دور کے عزیز رخصت ہو چکے تھے۔ آج ارشد کو یہ جگہ بہت اجنبی اجنبی سی لگی۔

اس نے عائشہ کے کمرے کی طرف دیکھا۔

یہی وہ جگہ ہے جہاں بیٹھ کر ہم نے اپنی محبت کے قصے بنے تھے۔ یہیں بیٹھ کر میں نے تم سے کہا تھا کہ چاہو مجھے کہ میں چاہے جانے کے لائق ہوں۔ یہیں بیٹھ کر ہم نے سوچا تھا ہم تم بہت اچھے انسان ہیں۔ یہیں ہم نے رنگوں کی باتیں سنی تھیں۔ خوشبوؤں کی کہانی لکھی تھی۔ یہیں ہم نے جھگڑوں کے حل اپنی محدود عقلوں کے بوتے پہ طے کر لئے تھے۔ یہیں سب سے چھپ کر کبھی سب کے آگے ملاقاتیں کی تھیں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں میں نے خود سر اناؤں کو معصوم جذبوں کی چادر اڑھا کر تمہارے بدن کو چھوا تھا۔ یہیں تم نے معصوم آنکھوں سے

پہلی دفعہ مجھ کو دیکھا۔ یہیں نرم ہونٹوں کو تم نے میرے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیا تھا۔ یہیں اپنی گودی میں سر رکھ کے تمنے کہا تھا کہ میں آپ کو چاہتی ہوں کہ اتنا کسی کو نہیں چاہتی ہیں۔ یہیں بیٹھ کر میں نے پہلی دفعہ زندگی میں یہ سوچا کہ جس سے محبت کرو اس کو چھولو تو سارے بدن میں عجب برق سی دوڑتی ہے۔ یہیں میں نے تمہاری گود میں سر رکھ کے سوچا تھا کہ اس سے زیادہ پناہیں کہیں بھی نہیں ہیں۔ اور آج میں خود کو بہت مطمئن ساد کھا کر تمہیں سوچتا ہوں کہ تم دور جانے والے کسی راستے پر اپنے خیمے کا بوجھ اٹھائے رواں ہو۔ بوجھل تھکن تمہارے چہرے پر بجی ہوئی ہے۔ خدا تم کو خوب خوشیاں دے عشو کہ تمہارا غم مجھ سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔

اور عائشہ ! تمہیں یاد ہے وہ آخری شام جس شام ہم نے طے کیا تھا کہ اس شام کے بعد ہم کبھی اس طرح نہیں ملیں گے۔ ہم نے اپنی اس ملاقات کو آخری ملاقات کا نام دیا تھا۔ نیم روشن کمرے کے باہر پتھریلے فرش پر خزاں کے پتے آہستہ روی سے کھیلتے تھے۔ کس اطمینان سے ہم دونوں الگ ہوئے۔ اسی اطمینان نے ہم دونوں کو یقین دلایا کہ ساری کہی ان کہی باتیں ہم سمجھ چکے ہیں۔ اور جو نہیں سمجھے وہ کوشش کریں تو سمجھ سکتے ہیں۔ باہر دھندلی اور بے پروا شام ہماری منتظر تھی۔

ایک لمحے کو..... نہیں۔ نہیں کئی مرتبہ ایک دوسرے کے بدن کی محرومی کا خیال ہمارے دلوں میں نشتر بن کر اترا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو تھامے ہوئے کھڑے رہے تھے۔ باہر موسم دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ تمہارے گرم گداز، سانسوں کی تیز مہک اور بالوں کی مدھم خوشبو نے ایک عرصے تک مجھے بے قابو رکھا تھا اور یہ بتایا تھا کہ محبت میں جب جسم سپرد کیا جاتا ہے تو کتنی مسرت اور لذت اور ان دیکھی زمینوں کا لمس ملتا ہے۔

کھڑکی کے باہر روشنی کجلانے لگی تھی اور فضا کی خاموشی آنے والی رات کے سامنے سینہ سپر تھی۔ اور یہ بھی خیال آیا تھا کہ اب میری جان کا کونہ کونہ تمہاری آواز کے لمس کو ترسے گا۔ اور یہ بھی سوچا تھا کہ اب شاید کوئی عشو نہ ملے جس کی گود میں اپنی مرضی اور ارادے سے سر رکھ کر خاموش بیٹھا جا سکے۔

یہ بھی دھیان آتا تھا کہ اس شہر پناہ کا آخری دروازہ اب بند ہونے والا ہے جس کے اندر ایک عرصے تک ہم نے معصوم بچوں کی طرح آنکھ مچونیاں کھیلی تھیں۔ پھر گہرے آسمان

پر شفق کی سرخی پھیکی پڑنے لگی تھی۔

جب ایک دوسرے سے الگ ہونے کا وقت بہت قریب تھا تو ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت سی نصیحتیں کر کے خاموش ہو چکے تھے۔ اور اب ہمیں صرف اس ایک آخری لمحے کا انتظار تھا۔ اور وقت کیوں کہ رکتا نہیں اس لئے وہ آخری لمحہ آیا۔ اور وہ ایک لمحہ سارے ماحول پر چھا گیا۔ چھاتا چلا گیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو قریب کیا۔ اور آہستہ سے بہت آہستہ سے ایک دوسرے کے محروم ہونٹوں کو چوما۔ اور خدا حافظ کہا۔

تم اپنے کمرے سے نکل کر اپنی ماں کے کمرے میں چلی گئی تھی۔ جب تمہارے پیراہن کی پرچھائیاں بھی میری نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو میں نے سوچا کہ ہم دونوں اپنی اس خوب صورت اور جان سے پیاری دنیا کے ذمہ دار انسان ہیں اور ہم دونوں پر ہم دونوں کے علاوہ اس دنیا کا بھی حق ہے۔ ہم دونوں دنیا کے اس بے جا حق سے ہرگز نہیں مکر سکتے۔ ہم دونوں اپنی ذمہ داریاں ایمان داری سے نبھائیں گے۔ اور اسی فریب کے نشے میں خود کو گرفتار رکھیں گے کہ ہم اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ یہ نشہ کبھی نہ ٹوٹے ورنہ ہم دونوں کو ہماری دلربا اور ضدی یادیں ان سرکش گھوڑوں کی طرح اس میدانِ کارزار میں گھسیٹتی پھریں گی جن کے دلیر لڑاکا سوار گھوڑوں کی پشت پر جان دے دیتے ہیں اور رکابیں پیروں میں پھنسی رہ جاتی ہیں۔

عشو یہ نشہ نہ ٹوٹنے دینا۔ یہ ہماری تقدیر ہی نہیں ہمارا انعام بھی تو ہے۔

چق اٹھا کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔ عائشہ کی ماں نے کھڑکی بند کی اور اس کی طرف گھومیں۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھیں۔ اور ارشد کی آنکھوں میں جھانک کر اپنی بیٹی کی محبت کا سایہ دیکھا، دھیمے سے ارشد کا ماتھا چوما اور اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"جب وہ رخصت ہو رہی تھی تو اس نے کہا تھا کہ اماں ارشد کو اپنے پاس بار بار بلا لیا کرنا۔ وہ بہت دکھی ہو گا۔ تم اس سے باتیں کرو گی تو اس کا غم کم ہو جائے گا۔ اور ارشد...... تمہیں معلوم ہے عائشہ کے جانے کے بعد مجھے اس کی صورت تمہاری شکل میں نظر آنے لگی ہے۔ تم نے خود کو کیسا ویران بنا رکھا ہے۔ ایسے بے حواس تھوڑے ہی ہوا جاتا ہے محبت میں۔ خود کو سنبھالو۔ تمہاری بھی تو ذمہ داریاں ہیں ارشد بیٹے۔"

ارشد نے آنکھیں جھپکائے بغیر ان کی باتیں سنیں۔ جب وہ کہہ چکیں تو اس نے

دونوں ہاتھوں سے ان کے چہرہ تھامے ہاتھوں کو پکڑا۔ اپنی عشو کی ماں کے مغموم چہرے کو دیر تک دیکھا۔ پھر ان کے ہاتھوں کو اپنے چہرے سے آہستہ سے الگ کیا اور بغیر ایک لفظ کہے کمرے سے نکل کر گھر سے باہر آ گیا۔

مجھے محبت کے آداب نہ سکھائے جائیں۔ مجھے یہ بتانے کی زحمت نہ گوارہ کی جائے کہ اس سے بچھڑنے کے بعد دیوانہ بننے کی ضرورت نہیں۔ مجھے نہ سمجھایا جائے کہ میرے اوپر میرے گھر اور دنیا کی بھی ذمہ داریاں ہیں۔ مجھے ان باتوں کا علم ہے۔ مجھے یہ باتیں بتا کر مجھ پر یہ جھوٹ نہ ثابت کیا جائے کہ میں بدحواس یا بے حس ہوں یا اپنے آپ سے اپنے حالات سے ناواقف ہوں۔

ہاں.......... میں جانتا ہوں کہ میری دیوانگی میں اس کی رسوائی ہو گی۔ میرے غم کے اظہار اور گوشہ نشینی سے اسے دکھ ہو گا۔ میری خاموشی کی خبر سے اسے وحشت ہو گی۔

ہاں...... مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میں کسی کے دل کی ٹھنڈک ہوں۔ کسی کی آنکھ کا نور ہوں۔ میں کسی کا عصائے پیری ہوں اور کسی بہن کا.... اپنی اکلوتی بہن کا چہیتا بھائی بھی ہوں۔ مجھے سب معلوم ہے۔ مجھے سب معلوم ہے لیکن اوروں کو نہیں معلوم کہ اس دور جانے والی کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں بند کر کے، ذہن آزاد کر کے میں نے جو خود اپنے آپ ایک رشتہ ڈھونڈا تھا۔ وہ رشتہ تمام رشتوں سے بڑا ہے کیوں کہ میں نے اسے اپنی مرضی سے تخلیق کیا تھا۔

☆☆☆

گیتا نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"پھر کیا ہوا ارشد۔ مجھے اپنے اور عائشہ کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔"

ارشد آنکھیں بند کئے ہولے ہولے سانس لیتا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کئے کئے گردن پر مفلر درست کیا پھر آنکھیں کھول کر کھڑکی کے باہر کہرے سے پرے اس پہاڑی کو دیکھا جس کے دامن میں یہ دبلی پتلی لمبی سی لڑکی پہلی بار ملی تھی جو اب اس کی دوست بن گئی ہے۔ ارشد نے اس کی طرف دیکھ کر سوچا عشو نے اپنی شادی سے چند دن پہلے پوچھا تھا کہ تم مجھ سے کیا کیا چاہتے ہو۔

میں نے اسے بتایا تھا کہ کچھ خاص منظر ہیں جو مجھے تمہارے حوالے سے نظر آتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں گھنے اور خطرناک جنگلوں میں شکار ہو رہا ہو۔ تم میرے ساتھ ہو اور میں غیر

ضروری بہادری دکھا دکھا کر تمہیں خوش کر رہا ہوں۔

ایک بہت بڑے پرانے سے گھر کے، چونے سے قلعی کئے اونچی اونچی محرابوں والے دالانوں میں چوکی پر سفید چادر بچھی ہو۔ اس پر جانماز ہو۔ تم ایک گہرے رنگ کا دوپٹہ اوڑھے دعا مانگ رہی ہو۔ اے خدا! ارشد کو ہمیشہ اچھا رکھنا۔

آنگن میں گرمیوں کی چاندنی ہو۔ آسمان بہت صاف ہو۔ بالکل تنہائی ہو۔ کھجور کا درخت ایک دوست جیسا لگ رہا ہو۔ تم میرے برابر لیٹی ہو اور تمہارا سر میرے سینے پر ہو اور مجھے یقین ہو کہ رات بہت دیر تک رہے گی۔ اور عشو میرا دل چاہتا ہے کہ سردیوں کی صبح کی تیز ہواؤں میں دالان سے نکل کر باورچی خانے میں ہم دونوں جائیں۔ لکڑی کے چولھے پر خوب گاڑھی گاڑھی چائے بنائیں۔ تم دو پیالیاں لے کر، شال اوڑھے سرد ہوا میں نکل کر اندر والے کمرے میں میرے والدین کو چائے دے کر آؤ۔ پھر میں پیڑھی پر جگہ بنا کر تمہیں بٹھاؤں۔ پھر ہم دونوں بغیر منہ دھوئے ساتھ ساتھ چائے پئیں۔

اور عشو...... میرا بہت دل چاہتا ہے کہ میرے بچے تمہیں ماں کہیں۔

اس خواہش پر اس کی آنکھوں میں شرم چمکنے لگتی تھی۔

ہم دونوں ہنس پڑتے تھے۔ پھر ہم دونوں اداس ہو جاتے تھے۔

وہ بہت بہادر بن کر مجھ سے ایسے سوال کرتی تھی۔ وہ مجھے جتاتی رہتی تھی کہ وہ دور ہونے کے خیال سے نروس نہیں ہے۔ میں سب سمجھتا تھا۔ وہ اپنی خوش دلی سے مجھے ہمت دیتی تھی۔ لیکن مجھے اس کی یہ بات بری لگتی تھی۔ میں چاہتا تھا وہ میرے سامنے آیا کرے تو رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا کرے۔ اس دن کے خیال سے کانپ کانپ جایا کرے جب وہ مجھ سے دور کر دی جائے گی۔

”عشو جیسا مجھے محسوس ہوا کرے وہی تم بھی محسوس کیا کرو۔ مجھے سکھ ہو تو تمہیں سکھ محسوس ہو مجھے دکھ ہو تو تمہیں بھی دکھ محسوس ہو۔ جب میں آنے والے دنوں کے خیال سے افسردہ ہوتا ہوں اور تم خوش دلی کا اظہار کرتی ہو تو مجھے بہت زیادہ احساس کمتری محسوس ہوتا ہے۔ کیا تم بے حس ہو گئی ہو یا میں بہت حساس ہو گیا ہوں؟“

اس نے یہ سن کر باہر جھانکا تھا۔ کسی کو نہ پا کر مطمئن ہوئی تھی اور میری گود میں سر رکھ کر میرے ہاتھوں کو پکڑ کر بولی تھی۔

''میں بہت جلد یہاں سے دور چلی جاؤں گی۔ تمہیں چھوڑ کر۔ اگر اداس نظر آؤں تو تم بھی اداس ہو جاؤ گے۔ تمہیں دکھی دیکھ کر بہت گھٹن سی ہونے لگتی ہے۔ تم ہر چیز میں میرے شریک ہو گئے ہو۔ جہاں میں جا رہی ہو وہاں ہوا ہو گی بادل ہوں گے پرندے ہوں گے، سردیوں کی سنسان راتیں اور گرمیوں کی دوپہر کا سناٹا بھی ہو گا۔ پھولوں کی مہک ہو گی اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہو گی۔ میں شاعری نہیں کر رہی ان سب چیزوں میں مجھے تم کہیں نہ کہیں مل جاتے ہو۔ وہاں کبھی اکیلے کمرے کی تنہائی میں جب تم کسی بھی وقت یاد آؤ گے اور ہوا کا کوئی جھونکا، بادل کا کوئی ٹکڑا، پھولوں کی خوشبو، پہلے پانی کی سوندھی سوندھی مہک نے اگر مجھ سے پوچھ لیا کہ وہ کیسا ہے جسے تم چھوڑ آئی ہو۔ تو میں کیا جواب دوں گی۔ ارشد...... تم مجھے خوش خوش رخصت کرو گے تو میں تمہارا ہنستا ہوا چہرہ یاد رکھوں گی ورنہ تمہارا غمگین چہرہ میرے حواس پر چھایا رہے گا۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ تمہیں اچھی اچھی باتیں سنایا کروں اور تمہیں خوب خوش رکھا کروں۔ تم جانتے ہو ارشد میں تمہیں کیسے چاہتی ہوں جیسے ماں بیٹے کو چاہتی ہے جیسے بہن بھائی کو جیسے بیٹی باپ کو جیسے بیوی شوہر کو جیسے محبوبہ اپنے محبت کرنے والے کو۔ میں تمہیں الگ الگ انداز سے چاہتی ہوں اور مجھے اپنی ساری محبتیں اچھی لگتی ہیں۔ مجھے ہمیشہ ایسے ہی محبت کرتے رہنے دینا۔ ہماری محبت کو ہمارے ساتھ کی مدت سے مت ناپنا۔ ورنہ ہم دونوں گھاٹے میں رہیں گے۔''

میری گود میں سر رکھ کر وہ مجھ سے بہت دیر تک باتیں کرتی رہی تھی پھر اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔ میرے قرب کے خمار میں ڈوبی ہوئی وہ وحشت بھری گہری گہری اداس آنکھیں۔ مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا جیسے ایک دم سے وہ آنکھیں کچھ بول دیں گی۔ میں نے اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے تھے۔

''اور ارشد سنو۔ جب میں یہاں سے چلی جاؤں تو ہمیشہ یہی سنوں کہ تم ویسے ہی نڈر اور بے باک اور خود سر ہو جیسے میرے سامنے تھے۔ خود کو بدلنا مت۔'' اس نے عائشہ کا چہرہ ہاتھوں میں تھاما اور اس کی بند آنکھوں کی طرف دیکھ کر سوچا۔

میں اس لمحے کے کرب کو پہچانتا ہوں جب یہ یہاں نہیں ہو گی۔

یہ احساس کتنا شدید ہے کہ میں اسے حاصل نہیں کر سکا۔ توہین کا یہ احساس کتنا تلخ محسوس ہوتا ہے۔ یہ بچھڑ جائے گی اس تصور سے میں کتنا گھبرا جاتا ہوں۔ اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ

یہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے تو شاید میں خودکشی کر لیتا۔
عشو اس وقت تمہاری آنکھیں بند ہیں۔ میں کچھ بولوں گا تو تم آنکھیں کھول دو گی۔ مجھے تمہاری بند آنکھیں اچھی لگ رہی ہیں اس لئے کچھ نہیں بولوں گا۔ عشو میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اگر تم آنکھیں نہ کھولو تو بتاؤں۔ میں ایک بہت بڑے شہر میں ہوں۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔ میں ایک بہت اونچی سی عمارت کی چھت پر کھڑا ہوں۔ سارے شہر میں عمارتیں بکھری ہوئی ہیں جو کہیں کہیں دھند میں لپٹی ہیں اور کہیں کہیں چاندنی میں چمک رہی ہیں۔ میں جس عمارت پر کھڑا ہوں اس کے برابر ایک اونچی سی مسجد ہے۔ میرے ہاتھ میں ایک سانپ ہے۔ اتنا مجھے معلوم ہے کہ اس سانپ کو مارنے پر انعام میں کوئی چیز ملے گی۔ میں اس سانپ کا پھن پکڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہوں۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میرا چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ مجھے انعام میں کیا ملنے والا تھا عشو مجھے نہیں معلوم ۔ناگ کو مارتے ہی میری آنکھ کھل گئی تھی۔ لیکن خواب میں ہی مجھے بہت واضح انداز سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پورا خواب تم سے متعلق تھا۔
تم نے اپنے نفس کو مار کر میری محبت کو ہمیشہ کے لئے حاصل کر لیا تھا۔ ارشد۔ اسے عائشہ کی آنکھیں جملہ کہتی ہوئی نظر آئیں۔
عشو جانے سے پہلے میرے دکھوں کا اعتراف کر کے جانا۔ ورنہ میں تم کو معاف نہیں کروں گا۔ میرے دکھوں کا اعتراف ضرور کرنا عشو۔ اور تم مجھ سے یہ کہہ کر مت جانا کہ ارشد تم خوش خوش رہنا۔ تم یہ مت کہنا۔ اور تم وہاں پہنچ کر پورب کی طرف دیکھنا تو ہندوستان میں ایک شخص تمہیں نظر آئے گا جو اپنے پورے وجود کے ساتھ تمہیں چاہتا ہے۔ بس اس احساس سے ہمیشہ مطمئن اور خوش رہنا۔
اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میری طرف دیکھا اور بہت دیر تک دیکھنے کے بعد بولی۔
"تم کیا سوچ رہے ہو ارشد۔"
"میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا۔"
اس نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے میرے بال چھوئے، میرا چہرہ چھوا اور کہا تھا۔
"جھوٹے۔ میرے جانے کے بعد تم اگر پریشان ہوئے تو میں تم سے کبھی نہیں بولوں گی۔"

تمہیں معلوم ہی کیسے ہو پائے گا کہ میں پریشان ہوں کہ خوش۔" یہ جملہ کہتے ہوئے اسے سکون سا محسوس ہوا۔ گویا عائشہ کو یہ بتا کر اس نے واضح کر دیا ہو کہ تم جو اپنی شادی رچا کر اتنی دور جا رہی ہو تو وہاں سے میری خیریت کیسے پاؤ گی۔

جسے چاہیں اسے اس طرح کے نشتر چبھو کر خوش ہونا مرد کی فطرت ہوتی ہے۔ اور اس کا وہی اثر ہوا تھا جو وہ چاہتا تھا۔

عائشہ کی انگلیاں اور زیادہ کانپنے لگیں۔ اس نے اپنا چہرہ اور زیادہ شدت کے ساتھ اس کی گود میں چھپا لیا۔

اور ارشد نے اس وقت عائشہ کے دکھ کے متعلق ایک لمحے کو نہیں سوچا۔ صرف یہ سوچا کہ یہ اس وقت میرا حق ہے جو مجھے مل رہا ہے۔

مرد کبھی کبھی ایسے ہی کمینی حرکتیں کرتے ہیں۔

تب عائشہ نے دھیمے دھیمے کہا تھا۔

"ارشد۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں آنگن میں کھڑی ہوں، بارش بہت زوروں سے ہو رہی ہے۔ میں شرابور ہو گئی ہوں۔ ٹھنڈی ہوا سے میرا بدن کانپے جا رہا ہے۔ تم برآمدے میں کھڑے ہو...... لیکن میری طرف بڑھتے نہیں۔ تم معلوم نہیں میری طرف کیوں نہیں بڑھتے۔ شاید میں نے تمہیں منع کر رکھا ہے کہ تم آنگن میں نہ آنا۔ مجھے سرد ہواؤں میں کھڑے رہنے دینا اور بھیگتے رہنے دینا۔ کبھی کبھی میں بہت شرمندہ ہو جاتی ہوں تمہارے سامنے۔ تم معلوم نہیں مجھے معاف بھی کرو گے کہ نہیں۔ اے ارشد تم مجھے معاف کر دو گے نا؟"

ارشد نے اس کے چہرے کو اٹھا کر پھر اس کی آنکھیں دیکھیں۔ ان میں سچ تھا۔ پھر بھی ارشد نے اس سے یہ نہیں کہا کہ تم شرمندہ کیوں ہو۔ تم نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ تم مجھ سے معافی کیوں مانگتی ہو۔ ارشد اسے مطمئن نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے ڈر لگتا تھا کہ اگر عشو مطمئن ہو گئی تو اسے بھلا دے گی۔ اگر ندامت کا احساس ختم ہو گیا تو وہ محبت کی بازی جیت لے گی۔

خبر نہیں کہ میرے ہونٹ اب سیاہ پڑ چکے۔ میری ہڈیاں چیخ رہی ہیں۔ تڑپ تڑپ کر ابل ابل کر میرے جسم میں خون بہہ رہا ہے۔ کھال جگہ جگہ سے تڑخی ہوئی محسوس ہو رہی ہے، بدن پر ہر جگہ نظر آنے والے گھاؤ ہیں جو درد سے تپک رہے ہیں۔ ہر وقت محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی میری ساری رگوں کو زور سے نچوڑ رہا ہے۔ آنکھیں جمے ہوئے خون کی طرح سرخ ہو گئی

ہیں۔ دل کے آس پاس دھواں سا بھرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حلق سوکھے ہوئے تنے کی چھال کی طرح خشک ہو جاتی ہے۔ دل کے اندر جیسے کوئی سوئیاں سی چبھوتا ہے۔

صرف ایک بار میرے پاس آؤ۔ ہاتھ میں کھلا ہوا دھار دار خنجر لئے ہوئے۔ جلد آؤ۔ دیر مت کرو۔ قریب آکر میری ہڈیوں کو کاٹ دو۔ میرے بدن کو چھوٹی چھوٹی بوٹیوں میں بانٹ دو۔ کٹی ہوئی ہڈیاں فضا میں اچھال دو اور خنجر کی تیز نوک ڈال کر میری آنکھیں نکال لو۔ پھر اپنے ہاتھ سے گلا ذبح کرو۔ رکو نہیں۔ حلق کی گرگراہٹوں سے ڈرو نہیں۔ خون کے اچھال سے بچو نہیں۔ رگوں سے سب لہو نچوڑ لو۔ بدن کی جلد تیز نوک سے جگہ جگہ سے پھاڑ دو۔ بدن کے سارے رونگٹے چٹکیوں میں پکڑ کر اکھاڑ دو۔ پھر بدن پر لہو کا ناچ دیکھو۔ بدن کی ہڈیوں اور گوشت کی بوٹیوں کو ایک جگہ جمع کر کے آگ لگا کر راکھ کر دو اور ٹھوکروں سے اس راکھ کو اڑا دو۔

جلد آؤ عشو۔ بس آخری بار۔ بس آخری بار۔ بس تم سے یہ آخری سوال ہے۔

رات آہستہ آہستہ سمٹ رہی تھی۔ ہوسٹل کے کمروں کا شور مدھم ہو چکا تھا۔ دروازے پر آہٹ ہوئی ارشد کو محسوس ہوا جیسے کوئی باہر کھڑے ہو کر محسوس کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ میں سو گیا ہوں یا جاگ رہا ہوں۔

"کون ہے" ارشد نے پوچھا۔

"میں ہوں دروازہ کھولو۔" یہ بڑے کی آواز تھی۔

ارشد نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ بڑا اندر داخل ہوا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔

بڑا اتنی رات گئے کبھی نہیں آتا۔ کیا بات ہے۔

"گھر سے کوئی آیا کیا" ارشد نے سانس روکے روکے پوچھے۔

"نہیں، گھر میں سب ٹھیک ہیں تم بیٹھ جاؤ"

ارشد بیٹھ گیا۔

"ارشد"

"ہاں۔ کیا بات ہے کوئی خاص بات۔"

"نہیں...... کوئی خاص بات نہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم لوگ اب بڑے ہو گئے ہیں۔ جوان ہو گئے ہیں۔"

ارشد نے سوچا کہ کہہ دے کہ یہ اطلاع دینے کے لئے اس وقت رات میں زحمت

کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ معلوم نہیں کیوں اس وقت بڑے سے وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔

"معلوم نہیں ہم لوگ اپنے پیروں پر کب کھڑے ہوں گے؟" بڑا دھیرے سے بولا

ارشد اس کی طرف خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"پہلے تم ملازم ہو گے پھر میں۔ تم بڑے ہو۔"

"ارشد یہ اپنے اختیار میں کب ہے۔ تمہیں معلوم ہے کل یاسمین کی شادی ہے۔"

"یاسمین۔ کون یاسمین۔ وہ جو بچپن میں اپنی اماں کے ساتھ ہمارے گھر آتی تھی۔ نیلی آنکھوں والی۔ کب ہے اس کی شادی؟"

"کل" بڑے نے آہستہ سے کہا۔

"تو پھر" ارشد نے پوچھا۔

"پھر کچھ نہیں" بڑا آہستہ سے بولا۔ "اس کی آنکھیں آسمان کے رنگ کی تھیں۔"

اور تب ارشد کو محسوس ہوا کہ کمرہ چاروں طرف سے بند تھا۔ کھڑکیوں پر تاریک شیشے تھے۔ اندر کوئی روشنی نہیں تھی۔ اتھاہ تاریکی تھی۔ باہر سے کسی نے شیشے پر پتھر مارا۔ شیشہ چیخ کر ٹوٹا۔ باہر کی روشنی اندر آ گئی۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ تو یہ بات تھی۔ تب ارشد نے غور سے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا۔ کمرے سے نکل کر مڑ کر پیچھے کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ پیچھے ہی پیچھے۔ دور تک دوڑتا چلا گیا۔ اور وہاں جا کر رکا جہاں ندی کے کنارے ایک بوڑھا شخص دو بچوں کو لئے بیٹھا تھا۔

تمہیں کون سا رنگ پسند ہے؟"

ندی کے پار پھیلے ہوئے کپڑوں کو دیکھ کر بڑے والے بچے نے اشارہ کیا۔

"وہ والا"

"وہ آسمانی رنگ" بوڑھے آدمی نے پوچھا تھا۔

وہاں سے دوڑتا ہوا ارشد واپس اپنے کمرے میں آیا۔

تم نے تو کبھی بتایا ہی نہیں بڑے؟"

"کیا بتاتا، تم زیادہ تر خاموش رہتے ہو۔ پڑھتے رہتے ہو یا اپنے آپ سے الجھتے رہتے ہو۔"

"اس وقت میں تمہارے پاس اس لئے آیا کہ تمہاری ایک چیز میرے پاس ہے۔ جب تم لاما ٹینیر جا رہے تھے تو تم نے مجھے دی تھی۔" بڑے نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ چیز ارشد کے

ہاتھ پر رکھ دی۔ ارشد نے خوب غور سے دیکھا۔ وہی چیز تھی۔

"تم نے اب تک کیوں نہیں واپس کیا تھا؟"

"تم اسے توڑ دیتے پتھر سے۔ ایک بار تم نے بہت سی پرانی چیزیں، میری دی ہوئی بہت سی چیزیں غصے میں آکر توڑ دی تھیں۔ میں نے اپنے کمرے کے باہر آکر اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اسی ڈر سے نہیں دی یہ چیز۔ اور سب چیزیں توڑ دو تو کوئی بات نہیں۔ اسے مت توڑنا۔"

"کیوں۔"

اسے دھوپ میں رکھو تو چاروں طرف رنگ پھیل جاتے ہیں۔ طرح طرح کے رنگ۔ سرخ گلابی، پیلا، ہرا، اور...... آسمانی...... "اسے توڑنا مت۔ اچھا ارشد۔ اسے توڑنا مت۔"

بڑا چپکے سے اٹھا اور جانے کے لئے مڑا۔ ابھی وہ دروازے پر نہیں پہنچا تھا کہ ارشد نے کہا۔

"سنو۔ تم نے کبھی بتایا نہیں.........."

بڑا گھوم پڑا اور اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو غور سے دیکھا۔

"میں تمہیں کیا بتاتا۔ تم اس سلسلے میں میری کیا مدد کرپاتے۔ تم سیدھے منہ بات تو کرتے نہیں ہو۔ یہ بالکل ذاتی بات ہے۔ تم سے کیسے بتاتا۔"

ارشد نے دل میں سوچا کہ یہ سامنے دروازے کے پاس کھڑا میرا بڑا بھائی عجیب مٹی سے بنا ہے۔ اسے تو معلوم تھا کہ اسے کون سا رنگ ہے۔ اس نے وہ رنگ پکڑ کیوں نہیں لیا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ میرا کون سا رنگ ہے۔ تم ندی میں اتر کر وہ رنگ پکڑ کیوں نہیں لائے۔ تم کو تو معلوم تھا کہ ندی گہری نہیں ہے۔

ہاں ندی گہری تو نہیں تھی لیکن میں کبھی اترا بھی تو نہیں تھا۔ ناؤ سے چلا جاتا۔ لیکن میرے پاس پتوار کہاں تھی اور پتوار ہوتی بھی تو اتنی اتھلی ندی میں ناؤ کیسے چل پاتی۔

دونوں کچھ نہیں بولے۔ بڑا کچھ دیر ایسے ہی کھڑا رہا۔ پھر چپ چاپ چلا گیا۔

☆☆☆

ارشد کا ہاتھ پکڑ کر گیتا نے پوچھا۔

"بڑے نے تمہیں اس رات کیا چیز واپس کی تھی۔"

"کل میں وہ چیز تمہیں دے دونگا ہمیشہ کے لئے۔" ارشد نے مسکرا کر کہا۔

"کیوں مجھے کیوں دے دو گے۔" گیتا نے ہولے سے پوچھا جیسے وہ یہ پوچھتے وقت ڈر رہی ہو کہ اس کا جواب نہ مل جائے۔

"بس ایسے ہی۔" ارشد اس کی طرف پیار سے دیکھ کر مسکرایا۔

اس پہاڑی اسٹیشن پر تعینات ہوئے اسے چھ برس بیت چکے ہیں۔ میدان سے گیتا اپنے والدین کے ساتھ ہر سال آتی ہے۔ اس کے باپ کے پاس کپڑے کی چھوٹی سی مل ہے۔ سب سے پہلی دفعہ جب ان لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی تو اس وقت یہ لوگ رہنے کی جگہ نہ ہونے کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ ارشد نے جھیل کے کنارے کھڑے ہوئے ایک وجیہہ بوڑھے شخص کو اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ دیکھا۔

معمر شخص نے بتایا تھا کہ کسی ہوٹل میں کوئی کمرہ خالی نہیں ہے ہم لوگ آج ہی واپس لوٹ جائیں گے سامان سمیت۔

تب ارشد نے انہیں اپنے کالج میں تب تک رہنے کی دعوت دی جب تک ہوٹل میں کمرہ نہ مل جائے یا کرایہ پر مکان نہ دستیاب ہو جائے۔

اس کی اس دعوت کو سن کر اس لڑکی کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی تھی۔

"تھینک یو" اس نے احسان مندی کے جذبے کے ساتھ کیا تھا۔

اس نے مسکرا کر اس خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھا تھا۔

تین دن تک ارشد نے انہیں اپنے گھر بہت آرام سے رکھا۔ تیسرے دن گیتا کے باپ نے مکان کرایے پر لے لیا۔ تبھی سے ارشد اور گیتا میں ایک عجیب سا رشتہ پیدا ہوا۔ انہوں نے وہ مکان بعد میں خرید بھی لیا تھا۔

اس دفعہ ابھی ان لوگوں کو آئے ایک ہفتہ ہوا ہے۔ گیتا اسے کبھی کبھی خط بھی لکھتی۔ وہ پابندی سے جواب دیتا اور انتظار کرتا کہ کب میدانوں میں گرمی پڑے گی اور تیز گرم ہوائیں چلیں گی۔ کب گیتا آئے گی۔ اس نے گیتا کو اپنی پوری زندگی کے بارے میں بہت تفصیل سے بتا دیا تھا۔ گیتا کے ماں باپ پہاڑ کے نیچے اپنے کسی دوست سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ کالج میں وہ تنہا تھی اور ہمیشہ کی طرح کرسی کے پیچھے آکر ارشد کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی۔

"میں تم سے اب خوب واقف ہو گئی ہوں۔" گیتا نے کہا۔

اس نے سر پیچھے کر کے گیتا کو دیکھا۔ گیتا کا مطمئن چہرہ اس کے بالکل قریب تھا۔ وہ

مسکرایا۔

گیتا نے اس کے بالوں کو دیکھ کر کہا۔

ارشد اب تم بوڑھے ہو رہے ہو۔ دیکھو سفید بال۔" اس نے ایک سفید بال توڑ کر ارشد کی آنکھوں کے پاس لا کر کہا۔

ارشد نے سفید بال دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"گیتا تم میرا سر اپنی گود سے مت ہٹانا۔ تمہیں میری قسم۔ تمہارے ڈیڈی ممی بھی آجائیں تب بھی نہیں۔ میں تمہیں بہت چاہنے لگا ہوں گیتا۔" گیتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش رہی۔ پھر ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

"ارشد بابا۔ تم کسی کو نہیں چاہتے۔ ہاں میں تم سے سچ کہہ رہی ہوں۔ تم کسی کو نہیں چاہتے۔ نہ تم ارمل کو چاہتے ہو۔ نہ غزالہ آپا کو۔ نہ عشو کو اور نہ ہی مجھے۔ تم بس ایک شخص کو چاہتے ہو۔ تم کو بتا دوں کون ہے وہ۔ وہ تم خود ہو ارشد تم خود۔ تم اپنے آپ سے محبت کرتے ہو۔ اور خود اپنی محبت سے محبت کرتے ہو۔ میں تمہیں پچھلے چھ سال سے دیکھ رہی ہوں۔ تم نے سچ کہا کہ تم نے مجھ سے کچھ چھپایا نہیں۔ لیکن اپنے بارے میں تم خود بھی کچھ کم ہی جانتے ہو۔ بھلا مجھے کیسے بتا پاتے۔ میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ نہ...... بیچ میں مت بولو۔ تم اپنی محبت کی بہت قدر کرتے ہو اور اپنی بہت عزت کرتے ہو۔ جب تم دیکھتے ہو کہ تمہاری محبت ناکام ہو رہی ہے تو تم بے عزتی محسوس کرتے ہو لیکن کیوں کہ انسان بے بس ہوتا ہے اس لئے مجبور ہو جاتا ہے اور خود کو بے بس سمجھ کر چپ ہو جاتا ہے۔ تم یہ بھی نہیں کرتے۔ تم یہ کبھی قبول نہیں کرتے کہ تم بے بس ہو۔ تم اپنی بے بسی کو دکھ کا لباس پہنا دیتے ہو اور یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہو کہ تم دکھی ہو۔ تم بازی ہار جاتے ہو تو اسی ہاری ہوئی بازی پر دوبارہ مہرے سجا دیتے ہو۔ تم ارمل کو چاہتے تھے تو بڑے ہو کر اس کی شادی ہونے سے پہلے اس کے باپ کے پاس پہنچ کر اس کا ہاتھ کیوں نہیں مانگا۔ وہ ہندو تھی تو کیا ہوا ایک بار کوشش کر کے تو دیکھتے۔ غزالہ آپا کا معاملہ دوسرا ہے وہ شاید وقت سے پہلے جوان ہونا چاہتی تھیں پر عشو کے ساتھ تم نے کیا کیا۔ اسے پیار کرتے تھے تو اسے بھگا کر کیوں نہیں لے گئے؟ بولو۔"

ارشد کو محسوس ہوا گیتا کی آواز اس کے لئے ایک جلتی ہوئی زنجیر ہے جو اس کے کانوں کے آرپار کھنچی جا رہی ہے۔

اس نے گود میں سر رکھے گیتا کے چہرے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ "گیتا ارمل کی شادی کسی خراب جگہ تھوڑے ہی ہوئی ہے۔ اور عشو کا شوہر بھی بہت اچھا ہے۔ پھر عشو کی ماں زبان دے چکی تھیں۔"

"تو کیا تمہاری ذمہ داری یہ تھی کہ تم لڑکیوں کو کھاتے پیتے دولہے دے کر مطمئن ہو جاؤ۔ تم ڈرتے ہو ذمہ داری اٹھانے سے۔ تم چاہتے تھے کہ تمہاری پوری زندگی رومان میں گزرے۔ تم کسی ایک کے بن کر رہنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ تم ٹھنڈے دل سے کبھی غور کرنا تب سمجھ میں آپائے گا۔"

"کیا میں کوئی لوفر بدمعاش آدمی ہوں؟" ارشد نے دھیمے سے پوچھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اسے گیتا کی باتوں سے ڈر لگ رہا ہے۔

"میں نہیں جانتی کہ بدمعاش کیسے ہوتے ہیں اور اچھے لوگ کیسے ہوتے ہیں۔ تم غیر مرد ہو۔ میری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ تم میرے پاس میری گودی میں سر رکھے بیٹھے ہو۔ تم اگر بدمعاش ہو تو پھر میں بھی بدمعاش ہی ہوں گی۔ اب تم کسی کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے خود کو تیار کرو۔ اب تم شادی کر لو ارشد۔"

ارشد نے گیتا کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور کہا۔

مجھے نہیں معلوم گیتا تم نے آج ایسی باتیں کیوں کہیں لیکن میں سوچوں گا ضرور کہ تم نے کس حد تک صحیح کہا اور کس جگہ غلط کہا۔ لیکن میرا دل بہت اداس ہو گیا تب سے۔ دیکھو کھڑکی کے باہر مجھے جو کچھ نظر آرہا ہے وہ تمہیں اگر بتادوں تو تم میرا مذاق اڑاؤ گی کہ میں تمہیں دھوکہ دے رہا ہوں جیسے میں نے سب کو دھوکہ دیا۔ گیتا! مجھے کھڑکی کے باہر وہی رنگ نظر آرہا ہے۔ وہ بے نام رنگ جانے کہاں سے اڑتا ہوا آتا ہے اور میرے پورے وجود کو بے قرار کر دیتا ہے۔ معلوم نہیں عشو کیسی ہے آج کل؟"

"تمہیں عشو بہت یاد آتی ہے؟"

"ہاں بہت یاد آتی ہے۔"

"کیا یاد آتا ہے۔"

"اس کی آنکھیں یاد آتی ہیں۔ اس کی باتیں یاد آتی ہیں جب وہ مجھ سے کہا کرتی تھی کہ میں تمہیں بہت چاہتی ہوں ارشد۔ اس کے بال، اس کا چہرہ بہت یاد آتا ہے۔ بار بار یاد آتا ہے

گیتا۔ وہ جب مجھے پیار کرتی تھی تو اس کے گرم گرم ہونٹ میرے بدن کو جانے کیا دے جاتے تھے۔"

"لیکن ارشد تم نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ تمہیں کچھ اس کا بھی خیال آتا ہے کہ وہ تمہیں کتنا یاد کرتی ہو گی۔ اس کے دل پر تمہاری یاد کیا اثر کرتی ہو گی اور جب کبھی اس کا شوہر اسے تمہارے نام کا طعنہ دیتا ہو گا تو اس پر کیا گزرتی ہو گی۔ تمہیں عائشہ کی جو جو چیزیں یاد آتی ہیں سب تمہارے مطلب کی چیزیں ہیں۔ اس کے مطلب کی کوئی چیز تمہیں کبھی یاد نہیں آتی۔ اسی لئے میں کہتی ہوں اور میں غلط نہیں کہتی۔ بہت سوچ سمجھ کر کہتی ہوں کہ تم خود اپنے آپ کو چاہتے ہو اور اپنی محبت کو چاہتے ہو۔ تم ارمل عائشہ، غزالہ آپا اور مجھے ..... کسی کو بھی نہیں چاہتے۔"

ارشد نے محسوس کیا یہ باتیں سن کر ایک عجیب طرح کی بے عزتی محسوس ہو رہی ہے جیسے کوئی اپنے گھر بلا کر اسے ننگا کر رہا ہو۔ جیسے ماں کے سامنے کسی نے ماں کو گالی دے دی ہو۔

اس نے گیتا کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

گیتا آج تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ میں نے تمہیں اپنا ہر راز بتا دیا ہے کیا اس کی سزا ہے۔ تمہیں معلوم ہے تم اس وقت کتنی سنگدلی کی باتیں کر رہی ہو۔ تم ایسا کس لئے کر رہی ہو گیتا! بتاؤ۔"

"ہاں۔ تم نے اپنے متعلق مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اور جو نہیں بتایا وہ بھی میں سمجھتی ہوں۔"

"ارشد بابا!" وہ دھیمے سے بولی۔

"ہاں..... کیا ہے۔" ارشد نے اس کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔

"تم مجھ سے پیار نہیں کرتے ہو۔ تم ان ساری لڑکیوں سے انتقام لے رہے ہو جو اب تک تمہاری زندگی میں آئی ہیں۔ تمہیں جو لڑکی ملتی ہے تم اس سے محبت کرنے لگتے ہو۔ وہ چلی جاتی ہے تو تم دکھی ہو جاتے ہو۔ تم سب سے محبت کرنے ہی کیوں لگتے ہو۔ ارشد۔؟"

"اب سب سے کہاں کرتا ہوں۔" ارشد نے ہولے سے کہا۔ اور چپ ہو گیا۔

"کیوں۔ آج کل مجھ سے نہیں کر رہے ہو۔"

ارشد جھلا گیا۔

"آج کل؟ تم محبت کو اتنی کاروباری قسم کی چیز کیوں بتا رہی ہو گیتا! عشو سے بچھڑنے کے بہت سال بعد تم ملی ہو۔ تم میرے بارے میں اتنا کچھ جان گئی ہو کہ اب تمہیں غیر تصور کرتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے جیسے تم نے اگر مجھے چھوڑ دیا تو میں ننگا ہو جاؤں گا تم مجھے چھوڑنا مت گیتا۔"

گیتا اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ ارشد کو بہت سکون محسوس ہو رہا تھا۔

تمہیں عشو یاد آتی ہے؟" گیتا نے دھیمے سے پوچھا۔

"ہاں۔ بہت یاد آتی ہے"

"اور غزالہ آپا؟"

"وہ اور طرح سے یاد آتی ہیں۔"

اور ارمل......؟

پچھلے سال اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ ارشد نے یاد کیا۔

وہ پہاڑی سڑک پر موٹر سائیکل پر بیٹھا جا رہا تھا۔ ایک موڑ کاٹا تو سامنے ایک کار بیچ سڑک پر کھڑی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کا شوہر یا اس کا بھائی چسٹر پہنے گردن سے مفلر لپیٹے انجن کا بونٹ اٹھائے کچھ ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ موٹر سائیکل کی آواز سن کر اس نے سر اٹھایا اور ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا۔ لڑکی نے بھی ہاتھ سے اشارہ کیا۔ کار کے پاس پہنچ کر موٹر سائیکل کے بریک چرچرائے۔

اس نے انجن بند نہیں کیا تھا۔ کل برف باری ہوئی تھی۔ ہوائیں بہت ٹھنڈی تھیں اور نیچے وادی کی روشنیاں بہت دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔

موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ کی روشنی اس لڑکی کے چہرے پر پڑی اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"مسٹر۔ معاف کیجئے گا۔ آپ کے پاس اگر پیچ کش ہو تو دے دیجئے۔ ابھی لوٹا دیں گے۔"

ارشد نے اس آواز کا چہرہ غور سے دیکھا۔

"ارشد تم اپنی 'ریکھا گرت' کی کاپی ہمیں دے دو ہم کل لوٹا دیں گے۔"

ارشد نے ہینڈل گھما کر لائٹ اسکے چہرے سے ہٹائی۔ موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کی اور موٹر سائیکل بکس سے ٹول کر پیچ کش نکالا۔ مرد کے ہاتھ میں پیچ کش دے کر کنارے کھڑے

ہو کر اس نے لڑکی کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا اور سوچا کہ عمر نے اس کے چہرے کے بھولے پن کو بالکل نہیں بدلا۔ بس چہرے پر اچانک جوانی کی چمک آگئی ہے۔ لڑکی نے بھی چسٹر پہن رکھا تھا۔ اس کی بالوں کی چوٹیاں چسٹر کے اندر ہیں۔ اس کے بال اب اور بھی لمبے ہو گئے ہوں گے۔ سفید لباس پہنے گلے میں گلابی دوپٹہ ڈالے یہ بالکل شیرازی قاز کی طرح لگتی تھی جو گہرے تالاب میں آہستہ آہستہ بے آواز شور کے ساتھ تیرتی ہے۔ میں نے ایک دن اس کے بال چھوئے تو یہ کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی۔ میں نے اس دن دوبار اس کے بال چھوئے تھے۔ آج میں اس سے ضرور پوچھوں گا کہ جس دن یہ ٹرک میں سامان لدوا کر اپنے تھانے دار باپ کے ساتھ جیپ میں رخصت ہوئی تھی کس رنگ کا لباس پہنے ہوئی تھی۔

"سنیل جلدی کرو۔ انہیں دیر ہو رہی ہو گی۔" لڑکی مرد کے پاس جا کر تیز آواز میں سرگوشی کے لہجے میں بولی تاکہ موٹر سائیکل والا شخص یہ اندازہ کر سکے کہ ان لوگوں کو احساس ہے کہ ان کی وجہ سے اسے دیر ہو رہی ہے۔

ارشد کا دل چاہا کہ کہے کہ اچھی لڑکی تم زندگی بھر سڑک پر اسی طرح کھڑی رہو تو میں بھی یہیں کھڑا رہوں گا۔ تم آج برسوں کے بعد مجھے نظر آئی ہو۔ اتنی جلدی مجھے دیر کیسے ہو سکتی ہے۔

"نہیں۔ سڑک پر گھومتے رہنا تو میری ڈیوٹی ہے۔ آپ اطمینان سے موٹر ٹھیک کرلیں۔"

لڑکی نے اس کی طرف تشکر آمیز انداز میں دیکھا اور قریب آ کر پوچھا۔

"کیا کام کرتے ہیں آپ؟"

"میں فاریسٹ میں ہوں۔"

"اچھا۔ مجھے بہت اچھی لگتی ہے فاریسٹ کی نوکری۔ یہ میرے پتی ہیں سنیل تیواری۔ کمپیوٹر سافٹ ویئر کی ایک کمپنی میں منیجر ہیں۔ میرا نام ارملا ہے۔ ارملا تواری۔"

تمہارا نام ارملا تواری تو اب ہوا ہے۔ میں تو تمہیں جب سے جانتا ہوں جب تم ارل تھیں صرف ارل۔ جب ماسٹر صاحب تمہیں بھیج کر مجھے ناشتہ بانٹنے بلایا کرتے تھے اور تم ڈیسک پر آ کر مجھ سے پوچھتی تھیں کہ تم روکیوں رہے ہو ارشد۔ کیا گھر پر ڈانٹ پڑی ہے۔ جب تم مجھ سے 'ریکھا گڑت' کی کاپی مانگ کر لے جاتی تھیں۔ پھر ایک دن تم اپنے ماں باپ اور بھائی کے

ساتھ وہاں سے ہمیشہ کے لئے چلی گئی تھیں۔ اس دن تم نے کون سے رنگ کے کپڑے پہنے تھے۔ تمہیں اب یاد بھی نہیں ہوگا۔ کتنی دیر میں پلیا پر بیٹھا تمہاری جیپ کا انتظار کرتا رہا تھا۔ تمہاری جیپ آئی تھی۔ تم نے مجھے کاپیاں واپس کی تھیں۔ ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا تھا اور جیپ چل پڑی تھی۔ راستے کے درختوں کے سایے سے گزرتی ہوئی، دھوپ چھاؤں میں ہوتی ہوئی جیپ آگے ہی آگے بڑھتی گئی اور آج جب تمہاری گاڑی رکی تو تم اپنے پتی سنیل تیواری کے ساتھ ہو۔ وقت کے داؤں پیچ بھی کیسے عجیب ہوتے ہیں ارمل۔

دستانے اتار کر ارشد نے سگریٹ نکالی اور سگریٹ سلگانے سے پہلے اس نے پوچھا۔

"آپ سگریٹ لیں گے مسٹر سنیل"

"اوہ یس۔ پلیز مجھے جلا کر دے دیجئے"

ارشد ایک لمحہ کو رکا۔ یہ تیواری تو برہمن ہوتے ہیں۔

"میں...... مسلمان ہوں۔ ارشد نے مضبوط لہجے میں کہا۔

سنیل نے بونٹ سے چہرہ اٹھایا

"نیور مائنڈ...... پیچ کش لیتے وقت بھی تو مجھے سوچنا چاہئے تھا کہ آپ ہندو ہیں کہ مسلمان اور ہندو ہیں تو نیچی ذات کے ہندو تو نہیں جو میں پیچ کش لیتے ہی کہیں گندا نہ ہو جاؤں ...... جلدی سے سگریٹ سلگائیے۔ میرے پاس تو کب کی ختم ہو گئیں۔"

ارشد نے سگریٹ سلگا کر اسے دی۔ اور سگریٹ کا پیکٹ اس کی جیب میں ڈال دیا۔

"میرے پاس موٹر سائیکل میں اور پیکٹ پڑے ہیں۔"

"تھینک یو۔ آپ تو بالکل فرشتہ ہیں۔ کیوں ارمل۔"

سنیل تیواری تم ارملا کو ارمل نہ کہنا کبھی۔ اسے ارمل کہنے کا حق صرف مجھے ہے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

تبھی سنیل نے اندر ہی اندر کوئی تار ملایا اور کار ایک دم سے گھر گھرا کر اسٹارٹ ہو گئی۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

اندر بیٹھ کر اس نے دوبارہ اسٹارٹ کیا۔ اور ہیڈ لائٹ جلا کر نیچے اترا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ کتھئی پتلون اور اسی رنگ کی جیکٹ پہنے سر پر کیپ لگائے گلے میں مفلر لپیٹے کھڑا ہوا وہ شخص دھیمے دھیمے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔

پچ کش لوٹاتے ہوئے ارشد نے اسے دیکھا۔ وہ ایک خوبرو جوان تھا۔ اور چہرے پر ویسا ہی اطمینان اور متوالا پن تھا جو پر سکون ازدواجی زندگی میں ہوتا ہے۔

"ہم لوگ کل یہاں سے چلے جائیں گے۔ میٹرو ہوٹل میں رکے ہوئے ہیں۔ کل آپ ہم دونوں کے ساتھ لنچ لیجئے مسٹر...... آپ کا نام کیا ہے؟"...... ارمل نے پوچھا۔

تب ارشد نے سگریٹ زمین پر ڈال کر اس پر جو تا رکھا۔ جیکٹ کے کالر نیچے کیے۔ مفلر کھول کر گلے سے لٹکایا اور کیپ اتار کر ہاتھ میں لے کر کہا۔

"میرا نام ارشد ہے ارمل۔"

ان دونوں کے چہروں پر حیرت چھا گئی۔ تب ارمل نے اچانک بہت خوش ہو کر کہا۔

تم وہی ارشد ہو۔ بالکل وہی ہو۔ تم اب بھی ناٹک جیسی باتیں کرتے ہو۔ تم کتنے چھوٹے تھے پر اپنی ہمت دکھانے چھرے والی بندوق لے کر ہمارے گھر کی طرف کبوتر مارنے آتے تھے۔ پتاجی اکثر تمہیں یاد کرتے ہیں ارشد!"

"اب بہت رات ہو رہی ہے سنیل ۔ تم لوگ ہوٹل چلو۔ کل لنچ میری طرف سے۔ تمہارے ہی ہوٹل میں۔ اب جاؤ۔"

"آپ آئیے گا ضرور۔ ورنہ ارمل بہت دکھ کرے گی۔

"میں ضرور آؤں گا۔ اب سردی ہو رہی ہے۔ تم لوگ چلو۔"

اگلے دن کھانا ختم کر کے سنیل اوپر کمرے میں کچھ لینے چلا گیا۔ تب ارشد نے ارمل کی طرف دیکھا۔ یہ کتنی خوب صورت ہو گئی ہے۔ اس کے چہرے کی جلد کتنی شفاف ہے۔

"جس دن تم وہاں سے چلی تھیں۔ تم نے کون سے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے ارمل؟" اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

"کپڑے......... یاد نہیں شاید اسکول کا ڈریس تھا۔ کیوں؟"

"کچھ نہیں ارمل۔ وہ جس رنگ کے کپڑے تھے وہ رنگ مجھے ہر طرف نظر آتا تھا۔ اب بھی نظر آتا ہے۔ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ وہ کون سا رنگ ہے۔"

تب ارمل نے بہت غور سے اپنے بچپن کے ساتھی کی طرف دیکھا اور کچھ سمجھتے کچھ نہ سمجھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"پاپا جی سپرنٹنڈنٹ پولس سے رٹائر ہوئے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے جب ارشد کی شادی

ہو گی تو ایک بار اپنے پرانے تھانے کی طرف چلیں گے۔ تم شادی میں ہمیں ضرور بلانا ارشد۔ ایک اچھی سی دلہن تلاش کر لو۔"

اس کا مطلب تم میری بات سمجھ گئی ہو۔ لڑکیاں جب لڑکوں سے ان کی شادی اور دلہن کی باتیں کرتی ہیں تو اس وقت ان کے لفظوں کے اندر بہت سے اور معنی بھی ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سمجھ لینے کا اظہار طرح طرح کے روپ دھار کر سامنے آتا ہے۔

"تم نے اس دن کون سے رنگ کے کپڑے پہنے تھے ارمل؟"

ارمل نے اس کی طرف بے بس نظروں سے دیکھا۔

"مجھے بالکل یاد نہیں ارشد۔ بھگوان کی سوگندھ۔"

"اچھا چھوڑو کوئی بات نہیں" ارشد نے یہ کہہ کر سر جھکا لیا۔ سنیل آ گیا تھا۔

جب وہ رخصت ہونے لگے تو ارشد نے بہت گرم جوشی کے ساتھ سنیل سے ہاتھ ملایا۔ ارمل خوش ہو گئی۔ ارشد نے ارمل کے سر پر نرم سی تھپکی دی اور ارمل کے چہرے پر پھیلتے ہوئے سکون کو دیکھ کر محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ ارمل کے سر کے لئے اجنبی نہیں ہے۔

"تم نے ایک بار کلاس میں میرے بال چھوئے تھے۔" ارمل نے اسے یاد دلایا۔

سنیل نے مسکرا کر ارمل کی طرف دیکھا۔

یہ بات تم نے اتنی آسانی سے، اتنے اطمینان سے کیوں کہہ دی ارمل۔

"ہاں۔ تمہارے سر پر اتنے ڈھیر سارے بال بہت اچھے لگتے تھے۔" وہ دھیمے سے بولا۔

یہ بات تم نے اپنے شوہر کے سامنے کیوں کہی۔ تم نے یہ بات چھپائی کیوں نہیں۔ تم بہت چالاک ہو ارمل۔ تم اپنے شوہر کو یہ بتانا چاہتی ہو کہ میرے بچپن کا یہ ساتھی مجھ سے اگر کچھ خصوصیت برتتا ہے تو اس میں کوئی اہم راز نہیں ہے۔ یہ اتنی آسان سی بات ہے کہ میں اسے تمہارے سامنے بھی کہہ سکتی ہوں۔ ہیں نا ارمل یہی بات تو ہے۔ اسی لئے تم نے یہ بات کہی۔ بولو۔

جب موٹر اسٹارٹ ہو گئی اور دور چلی گئی تو ارشد نے موٹر کے اندر ارمل کو اپنے شوہر کے قریب کھسکتے ہوئے دیکھا اور سوچا کہ محبت کی شدت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔ کبھی یہ صرف ایڈجسٹمنٹ ہوتی ہے۔ کبھی صرف ایک یاد اور کبھی ایک بے بسی کا روپ دھار لیتی ہے۔ اور کبھی کبھی لوگ محبت کے نام پر زندگی بھر ایک دوسرے سے دبی دبی نفرت کرتے رہتے ہیں۔

لیکن تبھی ارشد نے دور ہوتی ہوئی کار کے اوپر اسی بے نام رنگ کو چھپا کے لیتا ہوا

محسوس کیا۔ سرمائی پرندے دور دراز سے آتے ہیں۔ اجنبی پانیوں میں کچھ دن رہتے ہیں۔ پھر انہیں اپنی جگہ کے موسم کی پکار سنائی دیتی ہے اور پھر وہ قطار بنا کر اڑ جاتے ہیں۔ دور ہو جاتے ہیں۔ آسمان کے دھندلے پس منظر میں دھواں بن جاتے ہیں۔ اور اس منظر کی شدت سے گھبرا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"آنکھیں کھولو ارشد تمہیں غزالہ آپا پھر ملیں۔" گیتا اسے ازل کے پاس سے واپس کھینچ لائی۔

"بہت مرتبہ ملیں۔ اب ان کے تین بچے ہیں۔"

"اب بھی وہ تمہارے ساتھ اکیلے میں جاتی ہیں کہ نہیں؟" گیتا نے بہت مضبوط لہجے میں پوچھا۔

"تم اتنے ظالم سوال کیوں پوچھ رہی ہو گیتا۔"

"ایسے ہی بس مجھے اچھا لگ رہا ہے۔" گیتا نے شوخی سے کہا۔

"نہیں اب اتنا موقع ہی نہیں ملتا۔"

"اور عشو تمہیں بہت یاد آتی ہے۔" گیتا نے اچانک پوچھا۔

تب ارشد کرسی سے اٹھا۔ پیچھے کھڑی گیتا کو پکڑ کر کرسی پر بٹھایا اور زمین پر بیٹھ کر اس کی گود میں سر رکھ کر کہا۔

گیتا۔ مجھے سب کیوں یاد دلا رہی ہو۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ صاف صاف کہو۔ میں جیسا ہوں تمہارے سامنے ہوں۔ میں نے تم سے کچھ بھی نہیں چھپایا ہے گیتا۔"

گیتا نے اپنی گود میں سر رکھے اس شخص کو دیکھا اور اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں کو ساڑی کے پلو سے خشک کیا اور آہستہ سے کہا۔

"میں تم سے اس لئے ایسی باتیں کر رہی ہوں کہ میں تمہیں بہت چاہتی ہوں۔ میں اب تمہاری زندگی میں کوئی فریب کوئی دھوکہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ تم اپنے بارے میں جو کچھ جانتے تھے تم نے مجھے بتا دیا تو یہ میرا فرض تھا کہ میں جو کچھ تمہارے بارے میں سمجھتی ہوں تمہیں بتا دوں۔ اور کل میں تمہیں اپنے بارے میں صرف دو باتیں بتاؤں گی۔ کل میرے پاس اسی وقت آنا۔ ڈیڈی ممی دونوں نہیں ہوں گے۔ اب ان کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ تم جاؤ اب۔"

ارشد نے گیتا کی ہتھیلیوں پر اپنا چہرہ رکھ دیا۔ اس کی گرم گرم ہتھیلیاں بہت دیر تک اس

کے پاس رہیں۔

اپنے کاٹج پر آکر سونے سے پہلے اس نے ایک فیصلہ کرلیا۔

کل میں ہمت کر کے اس کے ماں باپ سے آخری بات کرلوں گا۔

جب امی اور بابا کو معلوم ہو گا کہ میں غیر مذہب میں شادی کر رہا ہوں تو کیا ہو گا۔ بابا اور خاموش ہو جائیں گے۔ اماں اندر والی کوٹھری میں جا کر تھوڑی دیر روئیں گی پھر چپ ہو جائیں گی۔ بڑا تو ویسے بھی کچھ نہیں کہتا ہے۔ وہ یہ تک تو بتا نہیں پایا کہ آسمان جیسے رنگ کی آنکھوں والی یاسمین سے وہ زندگی بھر محبت کرتا رہا۔ رضیہ ...... رضیہ کی شادی کا کیا ہو گا۔ ارشد کے غنودہ ذہن نے تھپکی دی۔ اب سب ترقی یافتہ ہو گئے ہیں۔ رضیہ سے شادی کرنے والے کو ہر گز یہ اعتراض نہیں ہو گا کہ رضیہ کا بھائی کسی غیر مذہب میں شادی کر چکا ہے۔ میں کل ہی گیتا سے بات کرلوں گا۔

اس کا ذہن نیند میں ڈوبنے لگا۔

کل تمہیں بتادوں گا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میں تمہاری ذمہ داری اٹھاؤں گا گیتا۔ میں کل ہی تمہیں اپنا شیشے کا وہ ٹکڑا بھی دے دونگا جس میں ست رنگی شعاعیں نکلتی ہیں۔ اچھا ہوا بڑے نے پہلے نہیں دیا تھا ورنہ میں اسے بھی توڑ ڈالتا۔ میں کل اسے تمہارے حوالے کرونگا گیتا۔

ایسا ہوتا ہے حالاں کہ کبھی کبھی ہوتا ہے لیکن آج ہوا۔ آج میں نے خود کو بہت ذلیل اور کمینہ محسوس کیا۔ کل میں یہ داغ دھو ڈالوں گا۔ کیا میں سچ مچ ایسا ہوں گیتا جیسا تم کہہ رہی تھیں۔ میں ایسا نہیں ہوں گیتا۔ وہ کون سا رنگ ہوتا ہے گیتا۔ اڑتا ہوا۔ پتنگ کی طرح جھپا کے لیتا ہوا۔ کبھی قریب آتا ہوا کبھی دور ہوتا ہوا اور کبھی بہت دور ہوتا ہوا۔

وہ سو گیا۔

صبح جب وہ سو کر اٹھا تو اس کا ذہن بہت ہشاش بشاش تھا۔ کھڑکی کھول کر اس نے سامنے والی پہاڑی کی طرف دیکھا۔ گیتا کا کاٹج لکڑی کے کھلونے کی طرح نظر آرہا تھا۔

آج میں آفس نہیں جاؤنگا۔ اس نے پل پل گن کر دن کاٹا۔

آج آسمان پر بہت بادل تھے۔ دن میں بھی غروب کے وقت کا سا سماں ہو رہا تھا۔

پہاڑی پر گیتا کے کاٹج کے موڑ پر سفید چادر لپیٹے وہ بوڑھا درویش ہمیشہ کی طرح بیٹھا تھا۔

ارشد نے رک کر جیب سے کچھ سکے نکالے اور اس کے پیالے میں چپکے سے ڈال دیئے۔ اس نے رک کر دعا کا انتظار کیا۔ درویش خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ایک 'ہو' کا نعرہ لگایا۔ ارشد کچھ دیر اس کے پاس کھڑا رہا۔ پھر کالج کی طرف بڑھ گیا۔ آج اس نے کوئی شعر بھی نہیں سنایا۔ ورنہ ہمیشہ اردو یا فارسی کا کوئی شعر ضرور پڑھتا تھا۔ موج میں آتا تو ہندی کے دوہے گانے لگتا۔ آج وہ کچھ خاموش سا تھا۔

کھڑکی میں اسے گیتا کا سایہ نظر آیا۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ آج وہ خوشی سے کھل اٹھے گی۔

"آؤ یہاں آؤ۔ میرے پاس بیٹھ جاؤ" گیتا نے پلنگ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ ایسے ہی ایک بار عائشہ نے مجھے اپنے پاس پلنگ پر بٹھایا تھا۔

وہ گیتا کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جلدی سے اپنا فیصلہ سنا دے۔

اس نے مٹھی کھول کر گیتا کے آگے کی۔ اس کی ہتھیلی پر شیشے کا چوکور ٹکڑا رکھا ہوا تھا۔

"یہ تم لے لو۔ اپنے پاس رکھ لو۔" ارشد نے بہت اپنائیت سے کہا۔

گیتا کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ خاموشی سے ارشد کے مطمئن چہرے کو دیکھتی رہی اور جب اتنی دیر ہو گئی کہ اس کا دم گھٹنے لگا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر شیشے کا وہ ٹکڑا اٹھا لیا اور ہتھیلی پر لے کر کھڑکی کے پاس لا کر دھوپ میں رکھا۔ ست رنگ شعاعیں نکلیں اور کمرے کی دیوار پر ناچنے لگیں۔

ارشد نے ان شعاؤں کو دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

"گیتا۔ یہ مجھے بچپن میں ملا تھا۔ یہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ ایک بار مجھے بڑے نے خوب تحفے دیئے تو میں نے شرمندہ ہو کر اسے یہ دے دیا تھا کیوں وہ ہمیشہ اسے مجھ سے مانگتا رہتا تھا۔ جس دن اس نے مجھے یاسمین سے اپنی محبت کا اشارہ دیا اسی دن اس نے مجھے یہ واپس کر دیا تھا اور مجھ سے کہا کہ اسے کبھی مت توڑنا۔ اس میں مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔ جیسے زندگی کے بہت سے رنگ ہوتے ہیں۔ یہ زندہ رہنے کا استعارہ ہے۔ اسے کبھی مت توڑنا۔ بظاہر یہ سپاٹ سا شیشے کا ایک ٹکڑا ہے لیکن روشنی میں لا کر دیکھو تو اتنے سارے رنگ تمہیں دے دیتا ہے۔ اسے کبھی مت توڑنا۔ تو گیتا میں نے اسے دوبارہ بہت احتیاط سے رکھ لیا۔ اسے میں زندگی کی طرح عزیز رکھتا ہوں۔ اب یہ تم رکھ لو ہمیشہ کے لئے"۔

گیتا نے اس کی باتیں سنیں اور مٹھی کو بند کر لیا۔ پھر اسے اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر ارشد سے کہا۔ "تم تکیے پر سر رکھ لو۔ میں تمہارے سینے پر سر رکھوں گی۔"

ارشد کو اس کی یہ خواہش بہت اچھی لگی۔ ارشد نے اس کے روکھے روکھے بال اور بے دھلے چہرے کو بہت چاہت سے دیکھا اور تکیے پر سر رکھ لیا۔ اور آہستہ سے اس کا سر کھینچ کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر خوب دیر تک چوما اور گیتا کی آنکھوں کو اپنی طرف کر کے ان میں جھانک کر کہا۔

"گیتا۔ میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں۔"

گیتا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور دھیمے سے کہا۔

"نہیں۔ تم آج بھی کچھ نہیں کہو گے۔ آج میں نے تمہیں بہت خاص بات کہنے کے لئے بلایا ہے۔ اگلے ہفتہ آج ہی کے دن میری شادی ہے۔ میری شادی یہیں پہاڑ سے ہو گی۔ شادی سے پہلے تمہیں اپنا ٹرانسفر کہیں اور کرا لینا ہے۔ شادی کے دوسرے ہی روز میں یہاں سے دلی جاؤں گی اور وہاں سے کینیڈا کی فلائٹ لے کر اپنے ہسبنڈ کے ساتھ کینیڈا۔ کل ممی اور ڈیڈی فکس کرنے گئے تھے۔ اور یہ سب میری مرضی سے ہوا ہے ارشد بابا۔"

ارشد نے اٹھ کر کھڑکی کے باہر بالکل نزدیک اڑتے بادلوں کو دیکھا اور سرمئی آسمان کو دیکھا اور یاد کیا کہ جب عائشہ کی ماں نے عائشہ کی شادی کی خبر سنائی تھی تب بھی میں اپنے آنسو چھپانے کے لئے کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ لیکن آج تو میری آنکھیں بھی خشک ہو گئی ہیں۔ ان میں آنسو کیوں نہیں آ رہے۔ کیا اندر تک سب کچھ خشک ہو گیا ہے۔ میں رو کیوں نہیں رہا۔

"تم مجھ سے وجہ نہیں پوچھو گے ارشد۔" گیتا نے ہولے سے کہا۔

وہ کچھ نہیں بولا۔

دور وادی میں کسی مسجد سے مغرب کی اذان بلند ہوئی۔

"میں نے تم سے اس لئے شادی نہیں کی کہ تم زندگی بھر مجھ سے اپنی محبتوں کا انتقام لیتے رہتے۔ میں زندگی بھر تم سے خوش نہیں رہ پاتی۔ میرے دکھ سے تم بھی ہمیشہ دکھی رہتے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو پاتی کہ میں کیوں دکھی ہوں۔ اسی لئے میں نے کل دل پر جبر کر کے تمہیں تمہاری ساری حقیقتیں بتا دی تھیں۔ میں تمہیں بہت چاہتی ہوں ورنہ اس وقت تم سے

اکیلے میں یہ ساری باتیں کبھی نہیں کرتی۔ میں کوئی تمہاری پابند ہوں؟۔ نہیں۔ لیکن میں اس وقت اکیلے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم زندگی کو بہت حقیقت پسندی کے ساتھ قبول کرو۔ زندگی کا دامن بہت بڑا ہوتا ہے لیکن شادی کا بندھن بہت تنگ ہوتا ہے۔ اس میں کسی اور کے تعلق کی گانٹھ نہیں سما سکتی۔ ہو سکتا ہے تم مجھ سے نفرت کرنے لگو۔ مجھے یہ منظور ہے۔ لیکن مجھے یہ منظور نہیں کہ تم نفرت بھی کرو اور دکھی بھی رہو۔ اور مجھے بھی دکھی رکھو۔ جب شادی کرنا تو بیوی سے ہرگز مت بتانا کہ تم نے کس سے محبت کی اور کسے چاہا۔ یہ سب تمہیں بہت اپنائیت کے ساتھ بتا رہی ہوں۔ اور کوشش کرنا کہ اب اگر کسی سے محبت کرو تو سچ مچ محبت کرنا۔ اپنے آپ کو کم دیکھا کرو۔ اپنی محبت کو ہی سب سے اہم مت سمجھا کرنا ورنہ زندگی بھر سکون نہیں پا سکو گے۔ دوسرا جو تم سے محبت کرتا ہے اس کی بھی تو ایک قیمت ہوتی ہے۔ وقار ہوتا ہے ارشد۔ صرف اپنے دکھ کو ہی دکھ نہ سمجھنا۔ دوسرے کا دکھ بھی اہم ہوتا ہے ارشد۔"

"تم نے گیتا یہ کیوں کہا کہ میں اپنا ٹرانسفر کرا لوں۔ اب اس سے تمہیں کیا غرض۔"

ارشد نے گھوم کر رسان سے لیکن بہت مضبوط لہجے میں پوچھا۔

جب وہ گھوما تو گیتا نے دیکھا کہ اس کے بال پیشانی پر بکھر گئے ہیں۔ ماتھے پر ایک موٹی سی لکیر ہے اور آنکھوں میں اس کا تھکا تھکا خود سر اور سرکش بچپن پھر واپس آ گیا ہے۔ وہ میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھ رہا ہے کہ میں اپنا ٹرانسفر کیوں کرا لوں۔ تمہیں اس سے کیا غرض۔

"اس سے مجھے غرض ہے۔ میں یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ تم چھٹی لے کر گھر چلے جاؤ تاکہ میری شادی نہ دیکھ سکو۔ لیکن میں نے یہ نہیں کہا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم یہاں سے پہاڑ سے ہمیشہ کے لئے چلے جاؤ۔ ورنہ جب تک رہو گے تمہیں میری یاد ستاتی رہے گی۔ اکیلے کمرے میں بیٹھ کر مجھے یاد کر کے رویا کرو گے۔ پھر میری یاد تمہاری نفرت کی بنیاد بن جائے گی اور تم بہت تلخ مزاج بن جاؤ گے۔ میدان واپس چلے جاؤ گے تو وہاں غم بٹ جائے گا۔ ماں باپ شادی کے بندھن میں باندھ دیں گے۔ میری یہ بات مان لو ارشد۔ مان لو گے نا۔؟"

ارشد ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اسے لگا جیسے اس کا ذہن بالکل سن ہو گیا ہے۔

"معلوم نہیں لیکن ہاں میں کل ہی چلا جاؤں گا۔" ارشد نے دھیمے سے کہا۔

"سائیں تیرے کارن چھوڑا شہر بلخ"۔

موڑ پر سے بوڑھے درویش نے صدا لگائی۔ اس کی آواز پہاڑیوں سے ٹکرا کر واپس آئی اور خاموشی چھاگئی۔

ارشد نے دھندلے ہوتے آسمان کو دیکھ کر آہستہ سے کھڑکی بند کر دی اور دروازے سے نکل کر سائبان کے نیچے آکر دور دور تک پھیلی ہوئی تاریکی میں ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔ گیتا دروازے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ ارشد نے دیکھا تاریکی کا ایک چوکور ٹکڑا سامنے سے ہٹا اور وہاں ایک جیپ آکر کھڑی ہو گئی۔ جیپ کے پاس ایک چھوٹا سا لڑکا ہاتھ میں بستہ لئے کھڑا ہے۔ جیپ میں بیٹھی لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر اسے نمستے کہا۔ جیپ اسٹارٹ ہوئی اور درختوں کے سائے میں کھو گئی۔

اب وہاں غزالہ آپا پیلے رنگ کے کپڑے پہنے بیٹھی ہیں۔ ان کے زانو پر ایک نوجوان لڑکے کا سر رکھا ہے۔ "تم کو معلوم ہے وہ ریلوے میں بہت بڑے افسر ہیں۔ اب ہم ریل میں مفت سفر کریں گے فرسٹ کلاس میں" غزالہ آپا کے ملازم نے فرسٹ کلاس کا ڈبہ کھولا اور غزالہ آپا اندر داخل ہوئیں۔ گارڈ نے سیٹی دی اور ٹرین چل پڑی اور اتنی تیزی سے چلی کہ پچھلا ڈبہ ایک لمحے میں نقطہ بن گیا۔

وہ نقطہ پھر واپس لوٹا۔ قریب آیا تو دیکھا کہ میری عشو دلہنوں والا سرخ لباس پہنے میری طرف آرہی ہے۔ اس نے میرے ہاتھ تھام کر مجھ سے کہا۔

جب میں چلی جاؤں تو میرے خیال سے پریشان نہ ہونا۔ ورنہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میں تمہیں۔۔۔۔ میں تمہیں ایسے چاہتی ہوں جیسے ماں بیٹے کو، بہن بھائی کو اور بیٹی اپنے باپ کو اور بیوی اپنے شوہر اور لڑکی اپنے محبوب کو چاہتی ہے۔ مجھے ہر انداز سے محبت کرتے رہنے دینا۔ مجھے روکنا مت۔ اب مجھے جانے دو۔"

یہ کہہ کر عشو نے خاموش کھڑے میرے وجود کو اپنے قریب کیا۔ میرے شانوں پر پیار کیا اور ڈولی کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔ کہاروں نے ڈولی کندھوں پر اٹھائی اور بابل گاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ آہستہ آہستہ تاریکیوں میں کھو گئے۔

کل اسی کمرے میں گیتا نے میرے چہرہ تھام کر مجھ سے کہا تھا۔

"میں سب اس لئے کہہ رہی ہوں کہ میں تمہیں بہت چاہتی ہوں۔"

یہ لڑکی مجھے بہت چاہتی ہے۔ میں اب کسی کی محبت پر شک نہیں کروں گا۔ مجھے بہت

جانے والی یہ لڑکی اگلے ہفتے دلی ایرپورٹ پر کھڑی ہوگی۔ اناؤنسر اعلان کرے گی۔ یہ لڑکی اپنے شوہر کے کاندھے پر ہاتھ رکھے جہاز کی سیڑھیاں چڑھے گی۔ جہاز رن وے پر آہستہ آہستہ چلنا شروع کرے گا۔ پھر ایک دم تیز تیز دوڑنے لگے گا اور پھر یکایک ایک جھٹکے سے آسمان کی طرف اٹھ کر بلند ہو جائے گا اور چند لمحوں میں تارا بن جائے گا۔

اور میں، جس سے رخصت ہو کر یہ سب جا رہے ہیں، کل پہاڑ سے چلا جاؤنگا اور میدانوں میں پہنچ کر وہ پراسرار رنگ تلاش کروں گا جو پل بھر کو سامنے آتا ہے۔ پھر غائب ہو جاتا ہے۔

"ارشد" گیتا نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دھیمے سے پکارا۔

"ہوا میں کیوں کھڑے ہو۔ اندر آجاؤ۔ تمہیں سردی ہو جائے گی۔" یہ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے لیکن اسے اب بھی میرا خیال ہے کہ مجھے سردی نہ ہو جائے۔

اس عجیب سے رشتے کو محسوس کر کے اس کا دل بھر آیا۔ اندر آ کر اس نے گیتا کے کندھوں پر سر رکھ دیا۔ گیتا نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ پھر دھیرے سے پوچھا۔" ارشد مجھے یاد نہیں کروگے"

"نہیں" اس نے دھیمے سے کہا۔ گیتا نے اسے اور مضبوطی سے لپٹا لیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آہستہ سے خود کو گیتا سے الگ کیا۔ اس کے بالوں کو برابر کیا، اس کی بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے ہاتھ سے خشک کیا اور خدا حافظ کہا۔ اس کے چہرے کو دیکھا اور دروازے سے باہر نکل آیا۔ باہر سفاک تاریکی راستہ روکے کھڑی تھی۔ دور دور تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس تاریکی کو دھکیل دھکیل کر آگے بڑھوں گا تو صبح تک پہنچوں گا۔ تب دھوپ کی آڑی ترچھی کرنیں مجھے روک لیں گی۔ ان سے لڑتا بھڑتا آگے بڑھوں گا تو پھر شام کو تاریکی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن آگے تو بڑھنا ہی ہے۔

کھڑکی کھلی۔ سلاخوں کی پرچھائیاں ارشد کے قدموں پر آ کر گریں۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سلاخوں سے لگی گیتا کھڑی ہوئی تھی۔ اسے اچانک یاد آیا کہ وہ کچھ بھولے جا رہا ہے۔ وہ کھڑکی کے پاس آیا۔

"گیتا۔ میرا شیشے کا ٹکڑا......"

گیتا باہر کی دھند میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"میرے قریب آؤ ارشد" گیتا نے آہستہ سے بلایا۔ وہ سلاخوں کے پاس آ گیا۔

"اپنا ہاتھ لاؤ" گیتا نے کہا۔

اس نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

گیتا نے اس کے ہاتھ میں شیشے کا وہ ٹکڑا رکھ دیا اور ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"مجھے خود یاد تھا کہ اسے اب تمہارے پاس ہونا چاہئے۔ تم اگر اسے آج نہیں مانگتے تو میں کل تمہیں پارسل کر دیتی ارشد۔"

ارشد بت کی طرح کھڑا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے اب کچھ نہیں کہنا ہے۔ تب گیتا نے اس کے ہاتھ پر اپنا سر رکھ دیا۔ اور پھر اسے آہستہ سے چوم کر ارشد کی آنکھوں میں دیکھ کر دھیرے دھیرے کہا۔

"مبارک ہیں وہ جو دکھی ہیں۔ اور مبارک ہیں وہ جو بچھڑ رہے ہیں۔ بہت جلد ان کی آتما کو وشانتا ملنے والی ہے۔"

گیتا نے ارشد کے ہاتھ واپس کئے

"جا رہا ہوں گیتا۔ خوش رہنا۔ خدا حافظ"

گیتا نے اپنا ہاتھ اٹھا کر دھیرے سے ہلایا۔

موڑ پر بیٹھے درویش نے بڑی دلدوز آواز میں مصرع اٹھایا۔

"اے امیر اب نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا"

ارشد مڑا۔ موڑ پر پہنچ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی۔ کمرے کی روشنی کی وجہ سے اس کا وجود ایک ہیولا سا لگ رہا تھا۔

روشنیاں بجھا دینا۔ اب میں واپس نہیں آؤں گا۔

بوڑھا درویش خاموش بیٹھا تھا۔ موڑ پر کھڑے ہو کر ارشد نے وادی میں ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھا اور اپنی مٹھی کھول کر دیر تک اس شئے کو دیکھا۔ ارادہ کیا کہ اپنی پوری قوت سے اسے تاریکیوں میں اتنی دور پھینک دے کہ پھر تلاش کرنے پر بھی نہ مل سکے کہ اچانک سامنے دھند میں ڈوبی پہاڑیوں کے پیچھے پھر اسے وہ رنگ ڈوبتا ابھرتا نظر آیا۔

اس نے مضبوطی سے مٹھی بند کی اور آہستہ آہستہ پہاڑی سے اترنے لگا۔

○○

8/2/2001

BAADEY SABAA KAA INTIZAAR *(SHORT STORIES)*

SYED MUHAMMAD ASHRAF

مصنف کی دیگر کتابیں

ڈار سے بچھڑے اور **نمبر دار کا نیلا**

(افسانوی مجموعہ) (ناول)

● یہ ایک بڑے ہی گہرے کرائسس کا ادب ہے اور مصنف نے دکھوں کے ڈھیر پر بیٹھ کر کھلی نگاہوں سے دکھ کا تماشا کیا ہے۔ اس صدی کے اختتام پر ایک سفاک، بے حس، بے علم جرائم پیشہ دنیا ظہور میں آچکی ہے۔ انسانوں کی کایا کلپ ہو رہی ہے۔ جب بھی اس نئی دنیا کی پنچ تنتر لکھی گئی، سید محمد اشرف کی چند کہانیاں اس میں ضرور جگہ پائیں گی۔

قرۃ العین حیدر

● افسانہ چاول پر قل ہو اللہ لکھنے کا فن ہے۔ یہ صرف بڑا افسانہ نگار جانتا ہے کہ اسے کیا نہیں لکھنا ہے۔ بڑا اور اچھا افسانہ محض افسانہ نہیں ہوتا بلکہ فکر اور دانش کی دولت سے بھی مالا مال ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کو زبان پر اگر قدرت نہیں تو مہارت یقیناً حاصل ہونا چاہئے۔ اشرف کو یہ مہارت حاصل ہو چکی ہے۔

قاضی عبدالستار

● اشرف نے "نمبر دار کا نیلا" میں ان توقعات کو پورا کیا ہے جو ہم سب کو ان سے ہیں۔

نیر مسعود

● اشرف کا ناولٹ "نمبر دار کا نیلا" دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ واقعی زبان ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں اور اردو کی تہذیبی روایت ان کے رگ و پے میں رچی بسی ہوئی ہے۔

انور خان

● تازہ شمارے میں سید محمد اشرف کی کہانی "باد صبا کا انتظار" کافی سے کچھ زیادہ ہی اچھی ہے۔ اردو پر اتنی اچھی کہانی شاید ابھی تک نہیں لکھی گئی۔

حسین الحق

☆☆☆☆☆

● اشرف کا ناول خوب، بہت خوب ہے۔ بے شک اتنا عمدہ فکشن اردو تو کیا انگریزی میں بھی میں نے بہت دن سے نہیں دیکھا۔

شمس الرحمن فاروقی

● ایک اور بات مجھے اہم اور گراں مایہ معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ افسانہ نگار اپنی تہذیب، روایات اور ورثے کا گہرا شعور بھی رکھتا ہے اور ان سے جذبے کی سطح پر مضبوطی سے جڑا ہوا بھی ہے۔ اپنے عہد کے سیاق و سباق میں یہ تہذیبی وجود جس بحران کا شکار ہے اس کا ایک کرب ناک احساس اشرف کے افسانوں میں موجود ہے۔

محمود ایاز

● "نمبر دار کا نیلا" میں ایک خاص عہد کے شعور کی سرحدوں کو پار کر لینے کی استعداد صاف دکھائی دیتی ہے۔ لفظوں ... ایک جاندار اور بڑا ذخیرہ، بیان کی ایک فطری مہارت، انسانی رویوں اور تجربوں کے علامتی تبدیل کا سلیقہ اور تخلیقی کاری کی خلاقانہ صلاحیت اور اسی کے ساتھ ساتھ تشدد اور دہشت کے موجودہ ماحول پر خاصی مضبوط فکری گرفت نے ناولٹ کو ایک یادگار تخلیق بنا دیا ہے۔

شمیم حنفی

● اشرف صاحب کا ناولٹ "نمبر دار کا نیلا" بہت پسند آیا۔ ناولٹ میں انہوں نے بڑے قابل یقین ... میں یہ دکھایا ہے کہ جانور بھی دھیرے دھیرے ان انسانوں کی تمام خصوصیات جذب کر لیتے ہیں جن کے ساتھ ... کی گذرتی ہے۔

فضیل جعفری

مہدی جعفر

● اشرف کی قصہ گوئی کی صلاحیت تسلیم کر لی گئی ہے۔

● سید محمد اشرف عصر حاضر کے اسی قصے کا راوی ہے جو میرے ظاہر و باطن میں بھی برپا ہے۔ افراد قصہ کے دور قریب آتے جاتے چہرے، میرے بھی جانے انجانے جذبوں کی پرچھائیوں سے ... اور مبہم ہیں۔

شمس الحق عثمانی

AD SHOT PUBLICATIONS
SANE BUILDING, 2nd FLOOR, 2 NANA BH...